جلد ۱۰۹ مارچ ۱۹۸۸ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

رسولِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم

از۔ اُمِّ فاروق

- کتاب جو ایمانی جذبات کو اُجاگر کرتی ہے۔
- کتاب جو حیات طیبہ کو خواتین کی نظر سے دیکھتی ہے۔
- کتاب جو حضورؐ کی شخصیت کو مختلف زاویوں سے پیش کرتی ہے۔
- کتاب جو رسولِ اکرم کی دعوت، خطابت، شفقت، عدالت، معاشرت، معیشت، معمولات اور ارشادات کا تذکرہ کرتی ہے۔
- کتاب جو لاجواب، بے مثال اور مقدس جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

ضخامت	سائز	قیمت
۲۴۰ صفحات	۲۳×۳۶ / ۱۶	ڈیلکس ۳۵/ پیپر بیک ۲۵/

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اُردو بازار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ ۱۹۸۸ء مطابق رجب ۱۴۰۸ھ	جلد ۱۰۹

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۴۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے ۔ فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

اشارات

احیائے اسلام کی تحریکیں دنیا بھر میں مسلمانوں کی ذہنی، تنظیمی، اخلاقی اور سیاسی اٹھان کا مؤثر ذریعہ بن گئی ہیں۔ اب ملتِ محمدیہ کے افراد سیاسی اقلیت اور معاشی محرومی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اگر کہیں بہیمیت کے ہاتھوں سفاکی کی تلوار سے ذبح بھی ہو رہے ہوں اور انسانی درندگی اُن کی بوٹیاں بھی نوچ رہی ہو تو کلمۃ اللہِ ھِیَ العُلیا (خدا کا کلمہ یا دین یا قانون سربلند ہونے کے لیے ہے) کی پکار کو وہ چھوڑنے پر تیار نہیں۔ کچھ نیک لوگ ان کو کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ کر سمجھاتے بھی ہیں کہ بھائیو اس طرح کا مجنونانہ ضدی پن چھوڑو، ظالموں کی باتیں مان لو، ان سے پیار کرو، تب کہیں تبلیغ کے دروازے کھلیں گے اور پھر تم اپنے مخالفوں کی اکثریتوں کو اندر سے فتح کر لو گے۔ مگر یہ نشہ کسی ترشی سے اُترتا نہیں۔

دراصل مسجدوں اور خانقاہوں اور مصحف و تسبیح کی حدود تک رہنے والے اسلام سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا۔ ہاں اگر کچھ بزرگانِ دین یا کچھ تنظیموں نے اسلام کو اس حالتِ مسکینی سے نکال کر نظریۂ الحاد اور دیگر مشرکانہ نظریوں کے خلاف سچ مچ کی توحید کا علم بلند کیا اور سیاست اور قیادت اور حقوق کے متعلق باتیں کیں، یا اپنی عبادت گاہوں، اپنے پرسنل لا اور اپنے ایمانی و تہذیبی تشخص پر ہونے والے حملوں کے جواب میں مہاتما بدھ کے بھکشو بن کر رہنے پر اکتفا نہ کیا، یا ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا پیش نہ کر دیا تو پھر ایسے اسلام کے علمبردار ہر جگہ غدار اور شر پسند قرار پائے ــــــ غیر مسلم اکثریت کے سامنے بھی اور مسلم اکثریت کے سامنے بھی۔ مگر وہ تحریکی برقی رَو کبھی رُک نہ سکی۔ ایک شخص سے دوسرے شخص، اور ایک نسل سے دوسری

نسل کو منتقل ہوتی چلی آئی - اور مشیت کا یہ نظامِ امتحان ہمیشہ برقرار رہے گا کہ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ترجمہ: اور اللہ (بصورتِ واقعہ) دیکھنا چاہتا ہے کہ کون پردۂ غیب کے ہوتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی حمایت پہ کمربستہ ہوتا ہے (الحدید - ۲۵)

اب اس دور میں جابجا مسلمانوں کے اندر جو ایمانی شعور پیدا ہوا ہے اس کی وجہ سے تحریکاتِ اسلامی کا تموج دیکھنے میں آتا ہے - یہاں تک کہ جذبۂ ایمانی رکھنے والے ایک ایک فردِ مسلم کے سینے میں نئی صبح کا ایک سورج اُبھر رہا ہے۔

عروج کی طرف بڑھتے ہوئے یہ ایک ایسا مرحلہ ہے کہ ہر طرف سے مخالف و معاند قوتیں چوکنا اور متحرک ہو گئی ہیں اور جو تدبیریں انہوں نے مسلمانوں کے خطرناک جذبۂ ایمان و جہاد کو کچلنے کے لیے امپریلزم کے دور میں شروع کی تھیں، اب یہ انتہائی شکل اختیار کر گئی ہیں - یہ تکلیف دہ صورت ضرور ہے، مگر مایوس کن نہیں - کیونکہ یہی وہ شدید مزاحمتی مرحلہ ہے کہ اگر مسلمان لٹ لٹا کر تھوڑی تعداد میں بھی اسے پار کر گئے تو دنیا میں نظامِ اسلامی کا محمدیؐ علَم لہرائے گا ـــــ اور ضرور لہرائے گا ـــ کسی دوسری چیز کا چلن مشکل ہو جائے گا۔

یہ حروبِ صلیبیہ کا ایک عجیب نیا دور ہے جس میں ان جنگوں کی شکست خوردہ روحِ بد ایک ایسی دومونہی ناگن میں بدل گئی ہے جس کے ایک سرے پر الحاد کا ڈنک ہے اور دوسرے پر مذہبی تعصب کا انتقامی زہر۔

ماضی کی حروبِ صلیبیہ شمشیر و تیر کے زور سے لڑی گئی تھیں، مگر نئی حروبِ صلیبیہ (جن میں الحاد اور عیسائیت اور دوسرے مسخ شدہ محدود مذہب شامل ہیں) تنزدیہ سے لڑی جا رہی ہیں - پرانی حروبِ صلیبیہ میں ہمارے مذہبی مخالفین ہی بھپر کر ہمارے سامنے اُٹھے تھے، مگر نئی حروبِ صلیبیہ میں بیشتر مورچوں پر مسلمانانِ کرام ہی تحریکاتِ اسلامی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں؛ البتہ ان کو روپیہ، وسائل، اسلحہ اور پروپیگنڈا کی مدد دینے والی مخالفِ اسلام قوتیں محاذ سے

بہت پیچھے بیٹھی دُور بینوں اور سیاروں کی مدد سے محاذ کا سارا کھیل دیکھ رہی ہیں ___ اور ہمارے اہلِ قوت، اہلِ دولت اور اہلِ دانش کے باطل نواز مخلصانہ کارناموں کی قہقہے لگا لگا کر داد دے رہی ہیں۔

ایسی شرم ناک حالت سے تاریخ میں کبھی ہمیں سابقہ نہ ہوا تھا کہ اسلامی نظریہ و تہذیب کے حق میں اور اس کے خلاف لڑائی لڑنے والے دونوں طرف مسلمان گروہ ہوں۔

پیچھے بیٹھے ہوئے، مگر صاف نظر آنے والے دشمن کے تزویری حربے اور وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے معاندین کا ایک دائرہ علمی ہے۔ اس دائرہ میں سب سے پہلے انھوں نے تجرباتی عقل کو معیارِ فیصلہ قرار دے کر ہمارے علوم کے بنیادی نقطۂ نظر کو مسلسل زد میں رکھا۔ عقل کے نام سے قیاس نے نظریۂ ارتقاء کا محل کھڑا کیا۔ پھر اس کاوش سے کچھ قواعد اخذ کیے گئے۔ نظریہ ارتقاء نے خدا کے تصور کو ختم کر کے مادی تصورِ کائنات کا کھونٹا گاڑ دیا۔ نظریہ ارتقاء میں معنیٔ جبریت پنہاں ہیں۔ لہٰذا اگر زیادہ قوت والا کمزور کو کچلتا ہے تو وہ عین نظامِ فطرت ہے۔ اس نظریے نے امپیریلزم کی پیش قدمی اور اس کے مظالم کے لیے جواز فراہم کیا اور اب بھی سرمایہ و اقتدار کی زیادتیوں کے لیے ارتقاء کا مفتی فتوائے جواز ہی دیتا ہے۔ ایک طرف تاریخ کی جبریت کو طبقاتی تصادم کی صورت میں پیش کیا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیشہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی تباہی کا سامان کرتا رہے اور اس عمل میں کسی قسم کے اخلاق کا دخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تاریخی جبریت ہے۔ مزید برآں انسان کو نفسیاتی جبریت کے شکنجے میں کسا ہوا دکھا کر اس کو خدا پرستی اور اخلاقی شعور سے آزاد کر دیا۔ یعنی قرار دیا گیا کہ وہ بھی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے۔ پھر یورپ میں چونکہ دَورِ علوم کا آغاز پادریوں اور دانشوروں کی نامعقول آویزش سے ہوا اس لیے دانشوروں کے ذہنوں میں مذہب و اخلاق کے ہر تصور کے خلاف باغیانہ ردِ عمل پیدا ہو گیا۔ بعد ازاں سیکولر جمہوریت اور نیشنلزم اور پارٹی سسٹم اور لبرل ازم کے تصورات بنتے گئے، حتیٰ کہ فلسفہ، معیشت، سیاست، نفسیات، اخلاق، سوشیالوجی وغیرہ علوم نئی بنیادوں پر مدون ہو گئے۔ مرد و زن کے تعلقات کے نئے معیارات نے معاشرت کو بدل دیا۔ وفاداری اور

پردہ داری کی بنیادیں ڈھے گئیں۔ کچھ لوگ ان علوم پر جدید لٹریچر پڑھ کر اور ان کی انسائیکلوپیڈیاؤں کے ترجمے کر کے وہ سارا فکری و نظریاتی زہر اپنی زبانوں میں منتقل کر لیتے ہیں، مگر کہیں تنقید کی جرأت نہیں کرتے۔

اب تازہ علوم کا یہ دریا مغربی امپریلزم کے سامنے ساتھ بہہ نکلا اور ہماری ظاہری غلامی ختم ہونے کے بعد بھی آج تک اس کی لہریں چڑھتی آ رہی ہیں اور ہمارے وہ سر ڈوبتے جا رہے ہیں جن میں ایمان کا سودا تھا۔

انہی علوم پر مبنی نصابی کتب بن کے آتی ہیں۔ اور اگر مقامی طور پر کچھ کتابیں لکھوائی جاتی ہیں تو وہ بھی مغربی نصابی کتب کا عکس ہوتی ہیں۔ نصابی کتابوں کی تصویریں بلحاظ لباس، بلحاظ گھریلو ماحول یا عمومی منظر، بلحاظ عمارات بالکل چربا ہوتی ہیں مغربی تصویروں کا۔ کہیں آپ کو اپنے کلچر کے رنگ میں رنگی تصویر نہ ملے گی۔ کتنی بڑی سازش ہے ایک قوم کو بیرونی فکر اور کلچر کی غلامی میں مبتلا کرنے کی!

ہماری ایک اور مصیبت یہ ہے کہ ایک تو انگریزی تعلیم کی برتری کے تخت کے پایوں کو گویا ہمارے سروں پر ٹکا کر کیلیں ٹھونک دی گئی ہیں۔ تعلیم میں آگے بڑھنا اور عہدے پانا یا ترقی کا کوئی اچھا راستہ اختیار کرنا انگریزی پرستی کے بغیر ممکن نہیں۔ اوپر وہ طبقہ سیاسی اقتدار اور دفتری نظام کی باگ ڈور تھامے بیٹھا ہے جس کی اکثریت چونکہ دورِ غلامی میں اچھی اردو نہیں سیکھ سکی تھی، لہٰذا وہ یہ چاہتا ہے کہ انگریزی ہی کا سکہ چلتا رہے اور اردو سر نہ اٹھا سکے۔ مارکیٹ میں انگریزی کی اس مانگ نے نہ صرف غیر ملکی مشنری اسکولوں کے لیے میدان کھول دیا ہے بلکہ ان کی دیکھا دیکھی ۲، ۲ سو اور ۴، ۴ سو روپے فیس لینے والے بہت شاندار مقامی پرائیویٹ سکول کھل گئے۔ جہاں درجہ اول سے "سی اے ٹی کیٹ" کا درس شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی بڑی فیسیں نہیں دے سکتے ان کے لیے ۵۰، ۶۰ روپے اور کہیں سو روپے ماہانہ فیس والے بے شمار مدارس گلی گلی میں کھل گئے ہیں۔

دوسری طرف عام سرکاری مدارس اور کالج ہیں، جن میں پڑھائی کی حالت یوں بھی قابلِ رحم ہی رہتی ہے۔ اور پھر وہ خصوصی اہمیت انگریزی کو دے نہیں سکتے۔ ان کی طرف صرف مفلس خاندانوں کے بچے جاتے ہیں، جن کے سامنے محنت مزدوری یا ادنیٰ قسم کی نوکریوں کے سوا اور کوئی منتہا نہیں ہوتا۔

اس طرح انگریزی والے اسکول آئندہ کے لیے اربابِ جاہ اور بیوروکریسی کے افراد کو تیار کرتے ہیں اور سرکاری درس گاہیں معمولی ملازم پیشہ اور مزدور پیشہ نوجوانوں کو میدان میں لاتی ہیں۔

اس طرح تعلیم و دانش کی ایسی تقسیم ہوتی ہے کہ کھلے کھلے دو طبقے ہمارے دیکھتے دیکھتے بن جاتے ہیں۔ ایک ایسا ہے جیسے برہمن، دوسرا ایسا ہے جیسے شودر۔ سارا معاشرہ دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ اور بدحال اکثریت کے اضطراب کبھی نہ کبھی قیامت اٹھا سکتے ہیں۔

یہ صورتِ معاملہ چونکہ ہمیں کمزور کرنے والی ہے اور اس میں سے راستہ نکلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کا ہم پر تسلط ہو، لہٰذا یہ معاندِ اسلام عالمی قوتوں کی پسندیدہ صورت ہے۔

برسبیلِ تذکرہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ صرف "زبان" ہی ایک تعلیمی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ تعلیمی نظام کی بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے مقصد کا کوئی تعین نہیں اور ساری تعلیمی پالیسیوں اور پورے تعلیمی عمل کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیسا انسان تیار کرنا مطلوب ہے۔ بلکہ زیادہ تر سانچہ وہی ہے جو لارڈ میکالے نے اختیار کیا تھا۔

ہمارے ہاں کے مرعوبِ مغرب طبقہ کی کسی حکومت سے نظامِ تعلیم اور موادِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی اصلاح و تجدید، خصوصاً اسلامی بنیادوں پر اس کی بحالی و استواری کے لیے مساعی کی توقع کرنا عبث ہے۔ کیونکہ دور دور تک پھیلے ہوئے بنجر ذہنی صحرا میں نہ کہیں پانی نظر آتا ہے نہ سبزہ۔ فقط سراب ہی سراب ہیں۔ آج تک تعلیمی تبدیلیوں کے جتنے سفینے چلائے گئے ہیں، انہیں سرابوں میں چلا کر غرق کیا گیا۔

یہاں کا ناقص، مقلدانہ اور مرعوبانہ نظامِ تعلیم سے نکل کر جب کوئی نوجوان لادین

غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پہنچتا ہے تو وہ ایسے نظامِ تعلیم سے دوچار ہوتا ہے جس کے چلانے والے اور پڑھنے پڑھانے والے سب کے سب اپنے سیکولر ذہن اور مادہ پرستانہ تہذیب پہ پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں۔ اس مضبوط قلعۂ الحاد میں باہر سے جب اکا دکا کمزور مذہبیت رکھنے والے نوجوان پہنچتے ہیں تو وہ مقابل کی صفوں کا یقین و اعتماد اس کے رہے سہے دھندلے ایمان کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ ایسی ہلکی سی آمادۂ شکست مذہبیت والے جوان بھی کم ہوتے ہیں، باقی سب کو پہلے ہی مفتوح ہو کر پہنچتے ہیں۔ میدان میں تو بعد میں جاتے ہیں، شکست گھر بیٹھے کھا چکے ہوتے ہیں۔

جس درجہ کا زلزلہ افگن معرکہ ہمیں درپیش ہے اس میں اسلام بہ طور ایک کمانڈر کے ایسے بے جان اور بھگوڑے سپاہیوں کی بڑی تعداد کو اپنے نام لیواؤں میں دیکھتا ہے جو خود بھی اُس پہ سنگ باری کرتے ہیں اور اب ہم ایٹم بم برسانے کے لیے مزید تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آخر یہ کیسا مجہول قسم کا نقشۂ احوال ہے۔ ہم لوگ کیسے تضادوں کی دلدل میں پھنسے پڑے ہیں۔ کسے پکاریں کہ وہ ہماری خبر لے، ہمیں یہاں سے نکالے ــ مگر نکلنے کو جی بھی تو چاہتا ہو۔ جو بلبل پنجرے کے لیے محنت راتب کا خوگر ہو گیا ہو، اُسے گُل و لالہ کی دنیا کبھی کھینچ نہیں سکتی۔ اُس کا ذوقِ پرواز تو مر چکا، وہ تو محض ایک مشتِ پَر ہے۔ نہ سوختنی، نہ فروختنی!

اسی کے ساتھ آپ ان ناولوں اور افسانوں اور شعری نگارشات کے طوفان کو دیکھیے جو مغرب کے سرچشمۂ الحاد سے "برکتیں" لے کر آ رہا ہے اور ہماری فکری اور صحافی اور ادبی کیاریوں کی آبیاری کر رہا ہے۔ بیج بھی وہیں کے، کھادیں بھی وہیں کی، پانی بھی وہیں کا، پھل بھی وہی، جو وہاں ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ "ادبی نظریات" تک بیرونی دنیا ہی کے، ہمارے مفکرین اور ناقدین اور جدید نگاروں کا سرمایۂ تخلیق ہیں۔ آج تک کوئی اپنا "ادبی نظریہ" یا مروج تصورات کے خلاف کوئی جزوی باغیانہ بحث بھی ہمارے ہاں زور نہیں پکڑ سکی۔ بلکہ دوسروں کی اصناف اور اسالیب سے ہڑا کہ جو چیزیں کبھی پہلے یہاں ایجاد بھی ہوئی تھیں، وہ بھی اب خانۂ ملت کے کباڑ خانے میں بند پڑی سڑ رہی ہیں۔ پھر اس کے پیچھے مستشرقین کا لٹریچر خدا

اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عقائد اور معجزات اور قرآن کے بیان کردہ تاریخی واقعات اور سیرتِ پاک کے احوال، نیز مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ابواب اور ان کی درخشاں شخصیتوں کے خلاف تشکک پرور بحثیں بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں سامنے لاتا ہے، جو سرے سے مذہب ہی سے دُور بھگا لے جانے والا ہوتا ہے۔ ورنہ کم از کم مذہب و سیاست کی تفریق کے غیر فطری تصوّر کو راسخ کر دینے والا۔ مستشرقین کا لٹریچر ہمارے نوجوانوں اور بزرگ اکابر میں بھی احساسِ کمتری پیدا کر کے ان کو ناکارہ بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

یوں دَورِ جدید کی صلیبی جنگ جو بے جان مذہبیت اور علمی الحاد اور تہذیبی بدراہی کی متحدہ قوت سے لڑی جا رہی ہے۔ ہمارے ایوانِ حکومت کے بعد سب سے بڑی اور کھلی ذلّت آمیز شکست ہمیں میدانِ تعلیم میں دے رہی ہے۔

پھر صلیبی جنگ کی اِن چند صفوں کے ساتھ ایک صف پادریوں کی بھی شامل ہے جن کا ایک کام تو یہ ہے کہ بغیر اسلام کو صحیح طور پر جانے اپنے مستشرقین کی رہنمائی میں عوام کو مغالطہ دینے والے وعظ سناتے رہے اور ایسے پمفلٹ شائع کرتے رہیں، جن سے تعصب کی دیوار موٹی ہوتی رہے۔ اِن پادریوں کا دوسرا حصّہ مسلمان معاشروں میں مشنری اداروں کے تحت عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ جدید مغربی تمدن کی برتری اور بڑی قوتوں کی برتری کا سکّہ بھی ہمارے دماغوں پر چلاتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک شاخ مناظرے اور مباحثے چھیڑتی رہتی ہے اور بسا اوقات اسلام اور نبیِ اکرمؐ اور مسلمانوں کے خلاف توہین آمیز باتیں لکھتی ہے۔ مگر ہم لوگ ان کے سامنے اس لیے دَبو بن کے رہتے ہیں کہ ان کے پیچھے جو قومیں اور حکومتیں ہیں انھی سے تو قرض اور اسلحہ لینا ہوتا ہے۔ اپنے دینی علماء کا تو بچہ بچہ ملّا ملّا کہہ کر مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔ مگر کسی بہت ہی پھٹیچر پادری (جو ہمارے ہاں کے خاکروبوں میں سے اُٹھا ہوا) کو ادب کے ساتھ ہولی فادر کہا جائے گا ـــــ عام جگہوں پر ہی نہیں، تھانوں میں، دفتروں میں، عدالتوں میں۔ اور اس دو رنگے طرزِ عمل پر کسی دانشور کو شرم نہ آئے گی۔ ایک اور ٹولی درس گاہیں کھول کر خدمت میں لگ جاتی ہے اور انگریزی زبان اور انگریزی ذہنیت سے ہمارے معصوم لالوں کو آراستہ کر کے، انھیں اپنے لباس پہنا کر، اپنے مذہبی گیت یاد کرا کے اپنی روایات

کی ترغیب دے کر انہیں سیاسی آزادی کے پردے میں تہذیبی غلامی کرنے کا سلیقہ سکھا کر، اسلام کی ہر پرچھائیں سے دُور رکھ کر اور اس سے بہ صد حکمت نفرت دلا کر اور بھاری فیسیں ہماری قومی دولت سے نچوڑ کر ہماری تباہی کا سامان کر رہی ہے۔ اُدھر بچے کو عیسائیت کے ساتھ دینِ الحاد اور تہذیبی مادہ پرستی کی تعلیم ملتی ہے اور اس کی ترقی و کامیابی پر ماں باپ ولے افرادِ خاندان پھولے نہیں سماتے، اور اِدھر گھر میں وہ کبھی کبھار خدا کا، محمد رسول اللہ کا، قرآن کا ذکر سُنتا ہے ـــــ اور دونوں طرف کی معلومات اس کے ذہن میں ہر آن ٹکراتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے گھر والوں کے کمزور سے مذہبی تصورّ کو عیسائی درس گاہ کی تعلیم نے پوری طرح پچھاڑ دیا ہے۔

انہیں پادریوں میں سے وہ بھی ہیں جو خدمتِ انسانیت کے لیے شفاخانے چلاتے ہیں۔ مریضوں کو اور تیمارداروں کو انجیل پڑھ پڑھ کر سُناتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کا نام لے کر دوائی لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ مریض (یا درس گاہوں کا کوئی طالب علم) غریب ہو تو اس کے بھاری مصارف اس شرط پر اُٹھاتے ہیں کہ وہ عیسائیت قبول کرلے۔ صرف مصارف ہی نہیں اُٹھاتے، بلکہ "موجاں" بھی کراتے ہیں؛ اور مجموعی طور پر اس مسمریزم کا معمول محسوس کرتا ہے کہ اس کا اسٹیٹس بلند ہو گیا ہے۔ اِس احساس کی وجہ سے وہ مقامِ کبر و تعلی سے اپنے معاشرے کے مذہبی و اخلاقی رنگ میں رنگے انسانوں کو حقیر اور محرومِ ترقی گردانتا ہے۔

پھر یہ لوگ کئی ملکوں میں ایسی کوشش میں پائے گئے کہ اپنی حکومتوں کو معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں راولپنڈی کے گارڈن کالج کے ایک سابق پرنسپل کے بارے میں ایسے انکشافات کی گونج پھیلی تھی۔

اِس تذکرے کے ساتھ عالمی پیمانے پر صلیبی جنگ کے بعض تجربات کی طرف اجمالاً اشارہ کرنا مطلوب ہے۔

۱۔ لبنان (موجودہ بربادی سے پہلے) ایک ایسا ملک تھا جس میں مسلمان اکثریت تھی، مگر مردم شماری کو روکے رکھا گیا اور پروپیگنڈے کے زور سے عیسائی اکثریت ثابت

کی جاتی رہی۔ پھر اسرائیلی اور شامی چپقلشوں کے درمیان ایک ایسا موقع پیدا ہوا کہ عیسائی آبادی نے مسلمانوں کی تباہی کی مہم شروع کر دی۔ یعنی ایک طرف سے اسرائیل کا حملہ تھا اور دوسری طرف سے عیسائیوں کا۔ حتیٰ کہ اب لبنان کا حصہ باقی اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ایک دشتِ یاس ہے۔

۲ — نائیجیریا ایک ایسا ملک ہے جہاں عیسائی اقلیت نے تعلیم، دولت اور عہدوں اور تعلیمی اور سوشل اداروں کے لحاظ سے اتنا زور پکڑ لیا ہے کہ مسلم اکثریت بے بس ہے۔ عدلیہ اور فوج سب پر عیسائی تسلط ہے۔ پچھلے دنوں مسلم اکثریت پر حملے ہوئے اور مسجدیں جلائی گئیں تو مسلمان بے بس ثابت ہوئے۔ اگر مسلمان اکثریت کبھی بھی کوئی اقدام عیسائیت کے خلاف کرنا چاہے تو نائیجیریا کے نصرانی دولت، اقتدار اور اسلحہ کی قوتوں کے لحاظ سے تیار بر تیار ہیں اور باہر کی عیسائی اقوام سے مدد حاصل کرنے کے انتظامات ہو چکے ہیں۔ عالمی پروپیگنڈا مشین پہلے ہی ان کے سامنے ہے، لہٰذا عیسائی ایک ہی ہلے میں پورا نائیجیریا ہڑپ کر سکتے ہیں۔

۳ — انڈونیشیا میں بھی اس وقت امریکی سپر پاور کی چھتری تلے عیسائی اقلیت خوب پھل پھول رہی ہے۔ وہاں کی حکومت سے سیکولرسٹ اور کمیونسٹ مسلمانوں کی مدد سے عیسائیوں نے "پنج شیلا" پر مبنی ایک الٰہی مذہب ایسا نافذ کرا دیا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے اسلام اور خاص طور پر نظامِ اسلامی یا دستورِ اسلامی یا قانونِ اسلامی کا نام لینا یا اس سلسلے میں کوئی کام کرنا سنگین جرم ہے۔ اس جرم کی بنیاد پر بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ اور بہت سے زندہ لوگوں کو لاشوں میں بدل دیا گیا۔ اس فضا میں بہت بڑی صلیب نصب ہے اور صلیبی جنگ کے فاتحین مفتوحین میں عیسائیت پھیلا رہے ہیں۔ اسلحہ اور پیسوں اور صحت و تعلیم کی خدمات کے ذریعہ اور انڈونیشیا کی فوج اور بیوروکریسی کے سہارے ڈبل مارچ جاری ہے۔

۴ — مصر اور سوڈان دو ملک ایسے ہیں کہ جہاں جنوبی علاقوں کی مضبوط عیسائی اقلیتیں ایک تو مسلسل مسلمانوں سے برسرِ کشمکش رہتی ہیں۔ اور اہم مواقع پہ قرآن اور مساجد کی بے حرمتی اور مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان پہنچانے سے بھی باز نہیں رہتی ہیں۔

دوسرے سامراجی اور تہذیبی اور مذہبی اثرات کو پھیلانے کا کام زور شور سے کرتی ہیں۔ تیسرے وہ ہر ایسی کوشش میں زبردست اڑنگا لگاتی ہیں کہ حکومتیں اسلام کی راہ پر ایک قدم بھی نہ بڑھا سکیں۔ نتیجہ یہ کہ احیائے اسلام اور نفاذِ شریعت کی عوامی تحریکوں اور مہمات کو حکومتیں کچلتی ہیں اور اس ٹکراؤ میں ایک طرف اقتدار پلپلا ہوتا ہے اور دوسری طرف اسلامی فورسز کے تموّج میں کمی آتی ہے، نتیجہ یہ کہ عیسائیوں کو کام کرنے کا اور زیادہ کھلا موقع ملتا ہے۔ اوپر سے سپر پاور حکومت کو قرضے اور اسلحہ کی داد و دہش سے متاثر کر کے اُن پہ دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ مسلمان بنیاد پرستوں کا قلع قمع کریں اور ہماری عیسائی اقلیت کو اندیشوں سے نجات دلائیں۔

۵۔ ہمارا ایک بڑا اور اہم برادر ملک ترکی ہے۔ جہاں کے عوام بہت مخلص اور اسلام اور پاکستان سے محبت رکھتے ہیں۔ ترکیہ کو شریعت سے انحراف کرانے اور سیکولرازم کی راہ پہ ڈلوانے میں نہایت غیر معمولی پارٹ یہودیوں کا ہے۔ تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید کو معزولی کی سزا یہودی سازش کاروں نے اس جرم پہ دلوائی کہ قومِ یہود وطن بنانے کے لیے فلسطین کی سرزمین کی مطالبے پہ جس کے سامنے دولت کی بہت بڑی پیش کش موجود تھی، سلطان نے یوں انکار کیا کہ میں مسلم اُمّہ کی امانتی سلطنت میں سے ایک مٹھی بھر مٹی بھی بڑی سے بڑی قیمت پہ نہیں دے سکتا۔ پھر یہودیوں نے خفیہ دونمہ تحریک کے پردے میں اپنی یہودیت کو چھپا لیا۔ بہت سے لوگ منافقانہ طور پر مسلمان بھی ہو گئے۔ اور مجلسِ استحاد و ترقی کے علاوہ اونچے درجے کی سفارتی سرگرمیوں میں دخیل ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے نظامِ شریعت کے خلاف اور سیکولرازم کی علمبرداری کے لیے نوجوان ذہنوں کو تیار کر لیا وہ دن اور آج کا دن، فوج سیکولرازم کی محافظ ہے۔ جو ہی اسلام کی کوئی کرن عوام میں جھلملاتی ہے، پہلے ہی حکومت اسے تباہ کر دیتی ہے۔ شہادت کے گھاٹ اترنے والے اہلِ علم و تقویٰ اور شاہین مزاج نوجوانوں کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ آج وہ ترکی کے لیے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوتے۔ طوفان اگر بڑھ جائے تو وہ فوراً حکومت کو فوجی قبضے میں لے لیتی ہے وہاں مارشل لا بھی آئین کا ایک حصّہ ہے۔ حالانکہ یہ فوجی قوت کا بار بار جمہوریت کے خلاف

استعمال یہ بتاتا ہے کہ رائے عام کے سوچنے کا راستہ دوسرا ہے۔
کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ ملک جو خلافتِ عثمانیہ کی آخری نشانی تھا، بجائے اس کے کہ زورِ انقلاب سے پچھلے نظام میں پیدا شدہ کمزوریوں اور خرابیوں کا ازالہ کرکے اور جہاں ضرورت ہوتی، افرادِ کار کو بدل کر نئی آن بان سے یورپ کے دروازے کے عین سامنے اسلام کو جلوہ گر کرتا، وہ بھی یورپ کے لادین تصورِ ترقی کی رَو میں بہہ گیا اور اقبال نے اس منظر پر یہ آہ سرد کی کہ:

لادینی و لاطینی کس پیچ میں اُلجھا تو
دارو ہے ضعیفی کا، لا غالب الا ہُو

مشہور وزیراعظم سراج اوغلو نے کہا تھا کہ آپ ۳۰ سال کی مہلت مجھے دیجیے، اس ملک سے مذہب کا نام و نشان مٹا دوں گا۔ ایک اور وزیراعظم رجب پیکر نے اسمبلی میں کمیونزم کو روکنے کے لیے اسلام سے کام لینے کی آواز اٹھائی تو جواب ملا کہ "نہیں، میں سرخ زہر کو دُور کرنے کے لیے سبز زہر کو استعمال نہیں کرسکتا"۔
باڑ کے بغیر ایسے ہرے بھرے کھیت کو دیکھ کر عیسائی مشن ترکوں پر ٹوٹ پڑے۔ سب سے زیادہ سرگرم "گواہانِ یہوا" ہیں۔ انھوں نے ترکی میں کام کا آغاز ۱۹۳۱ء میں کیا۔ اندازے کے مطابق اس وقت ترکی میں ۸۰۰ یہوا مبلغین کام کر رہے ہیں اور ۳۷۵۰ "گواہ" (نخچیرانِ صلیب) موجود ہیں۔ کلاگس جو جرمنی کے شہر HESSEN میں سرگرمِ عمل ہے۔ ایک ہزار ترکوں کو صلیب زدہ کرچکا ہے۔ یہ لوگ مادی، مالی، نسلی اور سماجی مسائل کی آڑ میں ۱۵ لاکھ ترکوں پر کام کر رہے ہیں۔
دوسری طرف ترکی میں اسلام کے فروغ کا کام کرنے کا راستہ بند ہے۔
۶۔ ملائیشیا میں آبادی کے تین متجانس حصے جمع ہیں۔ اور ان سب میں تحریکِ اسلامی کا کام پھیلانے کے لیے مسلمان اقلیت کوئی جدید اعلیٰ تکنیک اختیار نہیں کرسکی۔ بس اتنا ہی ہے کہ مسلمانوں کے اندر کام ہو رہا ہے۔ اور ان کی بڑی تعداد بہت حد تک اسلامی احکام و حدود کا احترام کرتی ہے۔ بس ایک قلیل عنصر میں بگاڑ پھیلا ہے، ساتھ ساتھ حالات جتنی گنجائش

دیتے ہیں، مسلمان اسلام کی تنظیمی اور سیاسی دعوت کی صدا بھی بلند کرتے ہیں اور حکومت سے بھی مطالبے کرتے رہتے ہیں، مگر یہ کام اتنا زوردار نہیں کہ آبادی کی الگ الگ قسموں اور کئی علاقائی بادشاہتوں کو صحیح نصب العین کے گرد جمع کر دے۔ قابلِ مسرت بات یہ ہے کہ نوجوان طبقہ جو اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی ممالک میں پہنچتا ہے، اسلام کے روحانی و انقلابی جذبوں سے آراستہ ہے اور اُسے دُنیا کی اسلامی تحریکوں سے محبّت ہے۔

۷۔ ایران انقلاب در انقلاب کے عمل سے گزر رہا ہے۔ بڑے انقلاب کے اندر خاصی اہم تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ اُدھر ایرانی لیڈر غیر شیعہ مُسلم اقوام کو محبت آمیز طریقوں سے قریب کرنے اور دعوت دینے کے بجائے ان کو خمینی کی لیڈری قبول کرنے کے لیے ڈرا اور دھمکا رہے ہیں۔ ایرانیوں کے تندو تیز پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ شو آف فورس کا جارحانہ انداز ایک طرف شیعہ اَمَل ملیشیا کے ہاتھوں فلسطینیوں کی تباہی کا باعث بنا۔ دوسری طرف شام کی "اخوان" دشمن اور اہلِ سنّت دشمن حکومت جو نہایت درجہ فاسد عقائد رکھنے والی جبر کیش حکومت ہے، اس سے ایرانِ جدید کی دوستی اتنی ہی حیران کُن ہے جتنی شیعہ آبادی اور مقدس زیارات رکھنے والے عراق سے غیر مختتم جنگ حیران کُن ہے۔ ایران نے اچھی بھلی اُبھرتی ہوئی اسلامی تحریکات کے نوجوانوں میں اوّل اوّل خلفشار پیدا کر دیا۔ البعد میں مسلمانانِ عالم اصل بات پا گئے۔ ایسی پالیسی کی وجہ سے ایران کے تعلقات اسلامی دُنیا سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی سپر پاور اس کو نقصان پہنچانا چاہے تو ایران نے بچاؤ کا سامان عالمی اور بین الاسلامی رائے عامہ کے ذریعے نہیں کیا۔

۸۔ افغانستان میں روسی جارحیت بظاہر آخری دموں پہ ہے اور افغانیوں کا نجات پانا صرف پلکوں کی سوئیوں کے نکلنے پر منحصر رہ گیا ہے، مگر THERE IS MANY A SLIP BETWEEN THE CUP AND THE LIP۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ اپنا کرم خاص فرمائے۔ امریکہ اور رُوس میں "یالٹا کانفرنس" کی طرح کی سانٹھ گانٹھ ہو گئی ہے۔ مگر مجاہدین بصیرت سے بھی کام لے رہے ہیں اور غیرت سے بھی! افغانستان میں اگر مجاہدین کامیاب ہو کر اسلام کا پرچم لہرا دیتے ہیں تو پھر اس کا مفید اثر پاکستان پر بھی پڑے گا۔

اور سپر پاورز کی نگاہوں میں آبادی کی یہ "خطرناک پٹی" کل خدائی نظامِ عدل وامن واخوت کا سرچشمہ بھی بن سکتی ہے۔

۹ — ہمارے پاکستان میں اگرچہ حالات قدرے بہتر ہیں، لیکن حکومت اور بیوروکریسی پر سپر پاورز کے ذریعے عیسائیت کا دباؤ رہتا ہے۔ یہاں بھی شفاخانوں کے علاوہ کثیر تعداد میں مشنری اسکول عیسائیت کی شفاف سی جھلی میں لپٹی ہوئی مغربی فکر اور مغربی تہذیب اور مغربی برتری کی تعلیم مسلمان شاہین زادوں کو دے کر انہیں خاکبازی سکھانے میں محو ہیں۔ آئندہ نسلوں کے پاس نہ اپنا مذہب رہے گا، نہ اپنی تہذیب، نہ اپنی زبان، اور یہی نسل سپر پاورز کی اشیر باد کے ساتھ حکمران اور کار پرداز ہوگی۔ بیچارے اسلام کو ان سے کس خیر کی امید ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہاں (اور جس بھی ملک میں شراب ممنوع ہو) اقلیتی مذہبی آزادی کے نام پر شراب کے پرمٹ حاصل کرتے ہیں اور پھر اس شراب کو مسلمانوں میں پھیلا کر ان میں بداخلاقی کو بھی عام کرتے ہیں اور احکامِ مذہب کے احترام کا خاتمہ بھی۔

ہمارے یہ پیارے بھائی وقتاً فوقتاً اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تاہم تبلیغی مساعی سے زیادہ تولیدی مساعی کام کرتی ہیں اور باہر سے درآمد بھی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح چند دوسری اقلیتیں بھی ہمارے اندر ایسی ہیں جن کی خاندانی منصوبہ بندی ایسی ہے کہ تعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھاؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی ایک سیاسی ہتھیار بھی ہے کہ جو مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کے معاندین کی تقویت کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ یہاں کی چند محدود اقلیتیں جب اسی نہج پر کام کریں گی۔ اور مسلمانوں کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کو اسلام کا چھٹا رکن بنا دیا جائے گا تو چند برس بعد یہاں کا تناسب آبادی خوفناک حد تک بدل جائے گا۔ خدانخواستہ ممکن یہ بھی ہے کہ پاکستان کے اندر سے ایک مخالف پاکستان قوت اُبھر کر بالادست بن جائے۔ اِدھر ہمارے دانشورانِ معیشت آبادی کو صرف خوراک کے مسئلے کے تعلق سے سوچتے ہیں، بلکہ سوچتا بھی کون ہے ؏

چشمِ نرگس مست و ساقی مست و ہم پیمانہ مست

کیا آپ اس صلیبی جنگ کی وسعتوں اور اس کے نتائج و اثرات کو سمجھ کر کوئی راہِ عمل

سکتے ہیں - افسوس کہ غالب قوتوں کے جادو نے آپ کے سوچنے کے قویٰ کو اس طرح معطل کر دیا ہے کہ جیسے ہیروئن کے نشے سے ہوتا ہے - آپ سوچیں گے بھی تو وہی کچھ جو اصل سوچنے والے سوچتے ہیں - ہمارے دردمند شاعر نے کیا خوب کہا:

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں	زباں میری ہے بات اُن کی
انھی کی محفل سنوار رہا ہوں	چراغ میرا ہے رات اُن کی

(باقی آئندہ)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں - قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں -

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

(۱)

پہلے یومِ استقلال پر قوم کے نام پیغام

یومِ دستور (یومِ استقلال) ہماری قومی تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ اس دن سے ہم اپنی زندگی کی ابتدا ایک ایسی آزاد قوم کی حیثیت سے کر رہے ہیں، جس نے آئینی طور پر خدا کی حاکمیت کا اقرار کیا، اور اقتدار کو اس کی طرف سے ایک مقدس امانت مان کر استعمالِ اقتدار کے لیے اس کے مقرر کردہ حدود کی پابندی قبول کی ہے۔ آج دُنیا کی تمام قوموں کے درمیان ہم وہ تنہا قوم ہیں جس نے اپنے دستورِ مملکت کے سرنامے پر یہ اعلان ثبت کیا ہے کہ ہم جمہوریت آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی انصاف کے اُس تصور پر عمل کریں گے جو اسلام نے ہم کو دیا ہے۔ اس لحاظ سے آج کا دن ہمارے لیے صرف ایک مبارک دور کا آغاز ہی نہیں ہے بلکہ ایک سخت آزمائش کے دور کی ابتدا بھی ہے۔ ہم نے خدا اور خلق، دونوں کے سامنے اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹی پر رکھ دیا ہے۔ اب دُنیا بھی یہ دیکھے گی اور دُنیا کا مالک بھی یہ دیکھے گا کہ ہم اپنے اس قول میں کہاں تک صادق اور مخلص ہیں۔

میں اس یومِ جمہوریہ پر اپنی قوم کو مبارک باد بھی دیتا ہوں کہ اور اس کے ساتھ ساری قوم سے اور اس کے ہر عنصر اور ہر گروہ سے یہ اپیل بھی کرتا ہوں کہ وہ تمام چھوٹے چھوٹے مفادات، تعصبات اور اختلافات کو نظر انداز کر کے اپنی توجہات اس مُلک میں ایک مثالی

اسلامی نظام قائم کرنے پر مرکوز نہ کر دے۔ ہم سب کی دنیا اور آخرت کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور کردار کو درست کریں، اپنے فرض کو پہچانیں اور نیک نیتی کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کریں جس کو ہم اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق حق جانتے ہوں۔ ہمارے حکام کو، ہماری سیاسی پارٹیوں اور اُن کے لیڈروں کو، ہمارے علماء کو، ہمارے تاجروں اور صنعت کاروں کو، ہمارے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو، ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں اور عوام کو اور ہمارے مردوں اور عورتوں سب کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اُن کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور پاکستان کا مستقبل اہلِ پاکستان کی سیرت و کردار کے ساتھ وابستہ۔ اگر ہم خدا ترسی، دیانت، انصاف، فرض شناسی، منظم محنت و جفاکشی اور اسلام کے اُصولوں کی مخلصانہ پیروی اختیار کریں تو ہماری یہ مملکت تھوڑی ہی مدت میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے مقام پہ پہنچ سکتی ہے۔ (ایشیا - لاہور - ۲۸ مارچ ۱۹۵۶ء)

---

(۲)

قراردادِ مقاصد کے معنی

(پاس شدہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء)

قراردادِ مقاصد

اس قرارداد میں کیا تھا؟ اس کی توضیح کے لیے میں اس کے وہ حصے لفظ بہ لفظ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو ہماری اس بحث سے متعلق ہیں:-

"چونکہ تمام کائنات کی بادشاہی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے ہے اور چونکہ وہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے باشندگانِ پاکستان کے ذریعے سے ریاستِ پاکستان کو اس لیے سونپا ہے کہ وہ اس اقتدار کو اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کے اندر استعمال کرے۔ لہٰذا یہ دستور ساز اسمبلی باشندگانِ پاکستان کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے آزاد و خود مختار ریاست پاکستان

کے لیے ایک ایسا دستور بنانے کا فیصلہ کرتی ہے۔

الف:۔ جس میں ریاست اپنے اقتدار و اختیارات کو باشندوں کے منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے گی۔

ب:۔ جس میں پوری جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور اجتماعی انصاف کے اُصولوں پر اسلام کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

ج:۔ جس میں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کی ان تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق منظم کر سکیں جو قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہیں۔

قرارداد کی تشریح

اس قرارداد میں جن باتوں کا اقرار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱— "بادشاہی کے جملہ اختیارات صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہیں"۔ یعنی پاکستان میں حاکمیت باشندگانِ ملک کی نہیں، بلکہ خداوندِ عالم کی ہے۔

۲— "پاکستان کی حکومت کو جو اقتدار ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے اور اس کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے"۔ یہ بعینہٖ وہی مفہوم ہے جس کے لیے قرآن میں "خلافت" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۳— اقتدار کی یہ مقدس امانت حکومتِ پاکستان کو اس لیے سونپی گئی ہے کہ وہ "اسے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے"۔ دوسرے الفاظ میں اگر حکومت خدا کی مقرر کی ہوئی حدود سے باہر قدم نکالے تو وہ خیانت کی مرتکب ہے۔ امانت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حدود اللہ کی پابند ہو کر رہے۔

۴— اقتدار کی یہ امانت حکامِ پاکستان کو براہِ راست نہیں سونپ دی گئی۔ بلکہ باشندوں کے توسط سے سونپی گئی ہے اور باشندے ہی اس کے مجاز ہیں کہ اس امانت کو اپنے چُنے ہوئے نمائندوں کے سپرد کریں۔

۵— یہ نمائندے حکومت کا سارا انتظام جمہوریت کی اس تشریح کے مطابق چلائیں گے،

جو اسلام نے پیش کی ہے"۔ دوسرے لفظوں میں یہاں جمہوریت کا نظام نہیں، بلکہ خلافتِ راشدہ کا نظام اختیار کیا جائے گا۔

۶۔ پاکستان کے ملکی قانون کی بنیادیں، آزادی، مساوات اور اجتماعی عدل کے اصولوں کی اس تشریح پر رکھی جائیں گی جو اسلام نے پیش کی ہے نہ کہ اس تشریح پر جو انگلستان، امریکہ یا روس میں اختیار کی گئی ہے۔

۷۔ "حکومتِ پاکستان مسلمانوں کو اس قابل بنانے کی ذمہ دار ہوگی کہ وہ زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں کتاب وسنت کے تقاضوں کو پورا کر سکیں"۔ یعنی یہ حکومت وہی فرائض سرانجام دے گی جو ایک اسلامی حکومت کے فرائض ہیں۔ وہ محض تماشائی نہ ہوگی۔ وہ محض سابق انگریزی حکومت کی طرح روادار نہ ہوگی۔ وہ مسلمانوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ دے گی کہ جس طرح چاہیں اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے رہیں۔ بلکہ ایجابی طور پر اس کا یہ فریضہ ہوگا کہ مسلمانوں کو اسلامی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرے۔

انہی باتوں کو دیکھ کر مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اسلامی حکومت کے قیام کا جو مطالبہ وہ کر رہے تھے اُسے مان لیا گیا ہے اور یہ مسلمانوں نے خود ہی نہیں سمجھ لیا، بلکہ ہمارے لیڈروں نے بھی اپنی تقریروں اور بیانوں میں ہم کو اس بات کا یقین دلایا کہ اس قرارداد میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غیر مسلموں کو بھی یہ اطمینان دلایا گیا کہ اس قرارداد پر جو اسلامی ریاست قائم ہوگی اس میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہوں گے۔ اس طرح یہ بات پبلک اور لیڈروں کے درمیان متفق علیہ ہوگئی کہ اب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(دستوری سفارشات پر تنقید - ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اِسلام میں اختلاف کے آداب

قرونِ خیر کے بعد اختلاف (۲)

ترجمہ و تلخیص جناب عبد الحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

تقلید اور اس کے نتائج اجتہاد کے متعلق جو نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس کا مختصر سا تذکرہ ہم پچھلے مباحث میں کر چکے ہیں۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس کے پیش نظر بھلائے اُمت کو خطرہ ہوا کہ اس دروازے سے کہیں ایسے لوگ بھی اس میدان میں داخل نہ ہو جائیں جو اس کی اہلیت سے بہرہ ور نہ ہوں۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ فتویٰ کا کام اب ایسے لوگ بھی انجام دینے لگے تھے جو نہ صرف یہ کہ امراء و سلاطین کے پروردہ تھے، بلکہ نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر نصوص و احکام کی گردنیں مروڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف علماء میں بھی دو طرح کے طبقے پیدا ہو گئے تھے۔ ایک طبقہ نے شدت اور سختی کی راہ اختیار کر لی تھی۔ اور دوسرے طبقہ نے رخصت و تخفیف کی راہیں نکال لی تھیں۔ یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے اُمت کے بہی خواہوں کو ان خطرات کا احساس دلایا جو اسلام اور مسلمانوں کے انجام کے بارے میں واضح طور پر اُبھر کر سامنے آ چکے تھے۔ حالات کا بغور جائزہ لینے اور خطرات کی سنگینی کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ اُمت کو تقلید کا پابند بنا کر اس پر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ مگر یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ ایک خرابی سے بچنے اور بحران سے نکلنے کے لیے اُمت کو تقلید کے قعرِ مذلت میں دھکیلنا ہی بہترین علاج تصور

کیا گیا۔

فقہاء کی باہمی لایعنی مناظرہ بازیوں، مباحثوں، ایک دوسرے کی مسلسل مخالفت اور ٹکراؤ کی صورتوں سے چھٹکارے کا انھیں یہی راستہ نظر آیا کہ اختلافی مسائل میں لوگوں کو متقدمین کے اقوال و آراء کی طرف رجوع کا پابند بنایا جائے۔ اسی طرح سلاطین کے تقرب، طلبِ دنیا میں انہماک اور اپنے فیصلوں میں راہ راست سے انحراف کی وجہ سے قاضیوں پر سے بھی لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا تھا، لہٰذا جب تک ان کا فیصلہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول کے مطابق نہ ہوتا، اسے قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا تھا۔

خدا کے خوف سے عاری شرعی علوم کے وہ حاملین جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے اجتہاد کو ایک ذریعہ سمجھتے تھے اس سے بچنے کی خاطر عام مسلمانوں کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید، ان کے اقوال کی پابندی اور ان کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں مسائل کا استنباط ہی واحد محفوظ طریقہ رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ امام الحرمین (متوفی ۴۷۸ھ) کے نزدیک محققین کا مشہور صحابہ کرام کی تقلید سے ممانعت پر اجماع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب ان ائمہ کے مسالک کی اتباع کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جنھوں نے تحقیق و جستجو اور غور و فکر سے کام لے کر ابواب قائم کیے، مسائل کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے متقدمین کے اقوال و آراء کو پرکھنے کے بعد انھیں اپنے لیے مشعلِ راہ بنا کر تمام قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اس سے امام الحرمین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عام آدمی ائمہ مجتہدین کے مکاتب فکر کی اتباع کا پابند ہے۔[1]

امام الحرمین کے اس قول اور اجماع کے متعلق ان کے دعوے پر انحصار کرتے ہوئے مشہور محدث و فقیہ ابن الصلاح (متوفی ۶۴۲ھ) نے ائمہ اربعہ کی تقلید کو واجب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان ائمہ اربعہ کے مسالک منضبط اور مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں اور ان کے تمام اُصول و شرائط بھی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ جب کہ یہ بات صحابہ و تابعین کے مسالک میں نہیں پائی جاتی۔ بعد میں آنے والے علماء و مصنفین ان کی یہ بات

---

[1] البرہان (۲/۱۱۲۶)، فقہ ۳/۱۱۷۳) اور التقریر والتحبیر (۳/۳۵۳)

اب تک نقل کرتے آرہے ہیں [1]

یہیں سے کتاب و سنّت کے علوم و فنون سے لوگوں کی غفلت و بے اعتنائی کا آغاز ہوا۔ اب لوگ صرف اقوال و مسالک کو بیان کرنے، ان کے اُصول و ضوابط مرتب کرنے، ان کا دفاع کرنے، ان سے مزید جزئیات نکالنے اور استنباط کرنے پر اکتفا کرنے لگے۔

زوال و انحطاط کا یہ عمل جاری رہا۔ اختلافات میں شدت آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ تقلید خالص پر صدیاں گزر گئیں۔ اس سے فکری تحریک رُک گئی۔ اجتہاد کا چشمہ خشک ہو گیا۔ فتنوں اور جہالت کا دَور دَورہ ہو گیا۔ لوگوں کی نظر میں فقیہ اور عالم وہ قرار پایا جس نے فقہائے سابقین کے اقوال و آراء کو قوی اور ضعیف کی تمیز کیے بغیر حفظ کر رکھا ہو۔ اور محدث وہ ٹھہرا جسے چند صحیح اور ضعیف احادیث یاد ہوں۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ حالات اس سے کہیں بڑھ کر روبہ انحطاط ہونے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے سے آفتابِ علم ہی غروب ہو گیا تھا۔ سوچ و فکر کی صلاحیتیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئی تھیں، بدعتوں کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ اور انحراف و بے راہ روی کے وسائل نے خوب رواج پالیا تھا۔ خرافات کی مختلف شکلیں مسلمانوں میں پھیل گئی تھیں جس نے دشمن حملہ آوروں کے لیے اس بات کی راہ ہموار کی کہ وہ اسلامی علاقہ جات اور شہروں پر قبضہ جما کر اسلامی تہذیب و تمدن کا ہی صفایا کر دیں۔

ماضیِ قریب کے مسلمانوں کا طرزِ فکر و عمل

فکری جمود و تقلید کی گود میں محوِ آرام مسلمان ماضی کے سنہرے خوابوں کا جال ہی بُنتے رہے اور دینی اور سیاسی قیادت کی راہیں الگ ہو جانے کی وجہ سے وہ حیران و پریشان مختلف راہوں پر بھٹکتے رہے۔ جب کہ اہلِ علم ان سے غافل ہو کر اپنی دُنیا میں مگن ہو گئے اور اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ انھی کی رائے ہی سب سے بہتر اور درست ہے۔ جو شخص بھی اس اُمت کے روشن ورثے سے واقفیت رکھتا ہو، اس کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جمود و تعطل کے شکار یہ پس ماندگان انھی اسلاف کے وارث

---

[1] التقریر والتعبیر (۳/ ۳۵۳)

ہیں جو متحرک اور روشن و تابندہ زندگی کے مالک تھے۔

اقوامِ یورپ نے جب خوابیدگی کا لبادہ اُتار دیا اور ترقی کی راہ میں نئی کروٹ لی اور استعماری پالیسی اپنائی تو مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر انھوں نے سمجھ لیا کہ جس قوم سے ان کا مقابلہ ہے اس کی حقیقی بنیادیں اب متزلزل ہو چکی ہیں۔ اعتقاد و ایمان کی چنگاری بجھ رہی ہے۔ یقین و اذعان کی پرانی کیفیت باقی نہیں رہی۔ اخلاق و کردار میں کجی راہ پا چکی ہے۔ استقامت و پامردی معدوم ہے، فکر و اجتہاد اور تفقہ و بصیرت کا فقدان ہے، بدعات کا دور دورہ ہے، سنت سے لوگ غافل ہیں اور شعور و بیداری کا کہیں دُور دُور تک کوئی نام و نشان نہیں۔ گویا یہ اُمت وہ اُمت ہی نہیں رہی جس کی شان و شوکت سے وہ اب تک مرعوب چلے آرہے تھے۔ تو انھوں نے یہ موقع غنیمت جانا، اور مسلم ممالک پر قبضہ جما کر زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اس اُمت کے تشخص کی بنیادوں میں سے جو تھوڑا بہت باقی بچ گیا تھا اُسے بھی نیست و نابود کر ڈالا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی ذلت و خواری کی جو کیفیت بنی وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے اُوپر حکومتوں کی باگ دوڑ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے، وہی ہمارے مقدر کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں اور ہم اپنے ہی ہاتھوں سے پیدا کردہ مشکلات و مسائل کا حل ان کے پاس ڈھونڈتے ہیں۔

اس عرصے میں بچے کھچے شعور کی بدولت مسلمانوں میں اپنے زوال سے نجات پانے اور لغزش سے بچنے کی چند کوششیں ضرور ہوئیں لیکن ان کی ہر کوشش سخت ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس لیے کہ انھوں نے کامیابی کی مطلوبہ شرائط پوری نہیں کیں۔ یہ کوششیں چونکہ غیروں کی تقلید اور فاتح اقوام کی اندھی پیروی ہی کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں۔ اس لیے حالات سازگار ہونے کے بجائے مزید ابتر ہو گئے۔ البتہ یہ بات خوش آئند ہے کہ اب مسلمانوں کی نئی نسل اس مرض کے لیے مرہم شافی اور صحیح حل کی تلاش کے لیے کوشاں ہے۔ چنانچہ فرزندانِ اُمت کے چند معتدبہ گروہوں کو اس بات کا شعور آ گیا ہے کہ "ان آخر ھٰذہ الامۃ لن یصلح الا بما صلح بہ اولھا" (اس اُمت کے پچھلے افراد کی اصلاح بھی اسی سرچشمہ ہدایت ہی سے ممکن ہے کہ جس سے اس کے اوّلین افراد کو ہدایت نصیب ہوئی تھی)۔ اس لیے

انہوں نے اگلوں کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اسلام کے چشمۂ شیریں سے سیراب ہونا شروع کیا ہے۔ اَلحمدُ لِلّٰہ اس بیداری کا آغاز ہو چکا ہے جسے اسلامی بیداری (یا اسلام کی نشأۃ ثانیہ) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

دشمنانِ دین مختلف مذاہب و افکار رکھنے کے باوجود اس دعوتِ مبارکہ کے لیے میدان کیونکر خالی چھوڑ سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ جنگ کے لیے ان کے پاس اسلحہ کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ہمارے کچھ بھائی بند بھی ان کا ایک ہتھیار ہیں، جو ان دشمنوں کے ہاتھوں آلۂ تخریب بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس بات کا ثبوت وہ بہت سے ادارے ہیں جن کا کام صرف اور صرف دیندار طبقوں کے خلاف سازشوں کے جال بچھانا ہے، وہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے اور اسے خطرناک چیلنجوں سے دوچار کرتے ہیں۔ دوسرے چیلنج اور رکاوٹیں ہی داعیانِ حق کی کوششوں کی بربادی کے لیے کافی تھیں کہ پھر اس بیداری کو " اختلاف " کے ہولناک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جس کی چٹان سے ٹکرا کر ان کی ساری کوششیں پاش پاش ہو گئیں۔ چنانچہ ہمیں نظر آتا ہے کہ مسلم نوجوان مختلف جماعتوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو سلفی کہتا ہے تو کوئی اپنے آپ کو اہل حدیث۔ کچھ اپنے آپ کو مذہبیت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کچھ مذاہب و مکاتبِ فکر سے الگ تھلگ رہنے کے دعویدار ہیں۔ پھر ایک دوسرے پر کفر و فسق، بدعت و انحراف، جاسوس اور کسی کا ایجنٹ وغیرہ ہونے کے ایسے الزامات عاید کرتے رہتے ہیں جو کسی مسلمان کو اپنے دوسرے بھائی پر ہرگز چسپاں نہیں کرنے چاہییں۔ چہ جائیکہ ان کی تشہیر کے لیے ہر ممکن وسائل کو بروئے کار لایا جائے اور اس طرح جان بوجھ کر یا لاعلمی میں کسی کو اس کی پروا نہیں رہی کہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے دوسرے حلقوں کی طرف سے جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے معمولی اختلافات کہیں زیادہ خطرناک نہ ثابت ہوں۔

ائمہ مجتہدین کے اختلاف کا جواز موجود تھا۔ مناسب اسباب کی وجہ سے ان کا اختلاف چند آداب و قواعد کا بھی پابند تھا، لیکن معاصرین کے اختلاف میں کوئی ایک بھی معقول وجہ

نہیں جو اُن حضرات کے ہاں پائی جاتی تھی - کیونکہ یہ اجتہاد کی صلاحیت سے بے بہرہ اور نرے مقلد ہیں - ان میں وہ بھی شامل ہیں جو تقلید سے برأت کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ ہم تقلید کیے بغیر کتاب و سنت سے براہ راست احکام اخذ کرتے ہیں - حالانکہ ان کا انحصار حدیث کی چند کتابوں پر ہوتا ہے - اور حدیث کی سند اور متن کے بارے میں وہ ان کتابوں کے مؤلفین کی پوری پوری تقلید کرتے ہیں - اور ان کتابوں میں استنباط کردہ مسائل اور فقہاء کے نقل کردہ اقوال میں ان کی پیروی کرتے ہیں - ان میں سے بہت سے حضرات اپنے آپ کو رجالِ حدیث، مراتب جرح و تعدیل اور تاریخ رجال کا عالم سمجھتے ہیں جب کہ اس بارے میں ان کا مبلغ علم یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر اس کے کسی ماہر کی زیادہ سے زیادہ ایک کتاب کا مطالعہ کیا ہوتا ہے - جس کی بنیاد پر وہ اپنے لیے منبرِ اجتہاد پر فائز ہونے کو جائز سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے اُونچا سمجھ بیٹھتے ہیں - حالانکہ جس شخص کے پاس تھوڑا سا علم بھی ہو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جاہلوں کی روش سے دُور رکھے، لوگوں پر الزام تراشی اور القاب بانٹنے سے باز رہے - اُمت کے عقائد کو درپیش چیلنجوں کی خطرناکی کو محسوس کر کے ان کا دفاع کرے - اور لوگوں کے اندر اتحاد و اتفاق کی رُوح بیدار کرنے کے لیے تگ و دَو کرے - اور نہیں تو کم از کم آدابِ تقلید کا ہی خیال کرتے ہوئے وہ تمام لوگ جو تقلید کرتے ہیں اور مختلف ائمہ کے اقوال پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں - اور ایسا کون ہے جو آج کسی نہ کسی صورت میں کسی کا مقلد نہ ہو (اگرچہ کچھ لوگوں کا دعویٰ کچھ اور ہے) انھیں کم از کم ان اُصول و آداب کی پابندی کرنی چاہیے جن کے گوشۂ عافیت میں ائمہ کرام سے اپنی زندگیاں بسر کیں -

دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کو اس بیداری سے یہ اُمید ہو چلی تھی کہ کفر و الحاد کے حامل نظریات اور باطل عقائد نے جو خلیج اُمتِ مُسلمہ کے وجود میں پیدا کر دی ہے اور جس نے اُمت کے ایک بڑے گروہ کے دلوں اور سوچ و فکر کی صلاحیتوں کو غلط راہ پر ڈال رکھا ہے - اسے پاٹنے کی کوئی راہ ضرور نکل آئے گی - آثار ایسے نظر آ رہے تھے کہ قلوب ضلالت و گمراہی سے نجات پا کر صحیح اسلامی عقائد سے روشن و پُر نُور ہو جائیں گے - جس کے بعد اس وسیع دُنیا

کو خدائی پیغام سے روشناس کرایا جا سکے گا اور زمین کے گوشے گوشے میں کلمۂ حق سربلند ہوگا۔ لیکن یہ دیکھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے کہ بعض مسلمان ہی اس بیداری کے بال و پر نوچ رہے ہیں اور اسے بے لگام اختلاف کی بیڑیاں پہنا رہے ہیں۔ چند ایک ایسے مسائل کو چھوڑ کر جو بجا طور پر سبب اختلاف بن سکتے ہیں زیادہ تر مسائل ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش بہت ہی محدود ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے مسلمان اس میں الجھے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے اپنی طاقت و قوت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اس اختلاف نے ان کی آنکھوں پر تعصب کی وہ پٹی باندھ دی ہے جس سے ان میں معمولی اور اہم، اور چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی۔ جس قوم کا یہ حال ہو چکا ہو اس سے یہ امید کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مسائل میں ترجیحات کا تعین کرتے ہوئے ان کے حل کی کوششوں کو مربوط و منظم کر سکے گی تاکہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کے آغاز کو مضبوط بنیادیں فراہم ہو سکیں۔

مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف کو بھڑکانا، انھیں ہوا دینا یا ان کے اسباب مہیا کرنا اسلامی اہداف کے ساتھ بہت بڑی خیانت، موجودہ اسلامی بیداری کی راہ میں بڑی رکاوٹ اور داعیانِ حق کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے، جسے اللہ تعالیٰ کبھی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے ایمان کے بعد عام مسلمانوں کا عموماً اور داعیوں کا خصوصاً سب سے بڑا اہم فریضہ یہ ہے کہ تمام اسلامی گروہوں اور دعوتِ اسلامی کا کام سرانجام دینے والے افراد کو متحد کرنے کا کام سرانجام دیں اور ان کے باہمی اختلافات کو ختم کرائیں۔ اگر کہیں اختلاف ناگزیر ہو تو بھی اس کا دائرہ بہت محدود رکھنے کی کوشش کریں اور سلف صالحین کے آداب کا ہر طرح خیال رکھیں۔ نیت اگر سچی ہو تو اختلاف رائے کے باوجود اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے دل باہم مل سکتے ہیں، خدا کی مکمل تائید و نصرت اور توفیق بھی تبھی حاصل ہو سکے گی۔

مُسلمانوں کا پہلا شہر

جناب شاہ بلیغ الدین صاحب

زمین صاف ہوگئی تو مسلمانوں نے جنگل سے بانس توڑے۔ کچھ کے ستون کھڑے کیے، کچھ سے چھپّر بنایا۔ یوں مکّے، مدینے سے کالے کوسوں دُور اللہ کے حضور سر جھکانے کے لیے ایک مسجد بنالی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتوحہ علاقے میں بنائی جانے والی یہ پہلی مسجد ہے۔ یہ مسجد حضرت عُتبہؓ نے بنائی۔

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُونچے پُورے قد کے آدمی تھے۔ مردانہ وجاہت کا بڑا اچھا پیکر! تیر چلانا خوب جانتے تھے اور ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کی تیراندازی کا دُور دُور شہرہ تھا۔ بدر اور اُحد میں حضرت عُتبہؓ کے جوہر خوب کُھلے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں: اُن سب لڑائیوں میں آپ نے شرکت کی جن میں حضور اکرمؐ نے حصّہ لیا۔ جہاد کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔ حضرت عُتبہؓ سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ دو مرتبہ ہجرت کا شرف حاصل ہوا۔ پہلے حبشہ گئے پھر مدینۃ النبیؐ۔

۱۴ھ میں حضرت عمرؓ نے ایک فرمان جاری کیا تھا۔ یہ حضرت عُتبہؓ بن غزوان کے نام تھا، جو سپہ سالار بن کر جا رہے تھے۔ امیرالمومنین کا ارشاد تھا کہ۔ خدا کی مہربانی اور مدد پہ بھروسہ کرکے عرب کے آخری سرے اور سلطنتِ عجم کے قریب ترین حصّے کی طرف کوچ کرو۔ پرہیزگاری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ خیال رکھو کہ تم دشمن کی زمین میں جارہے ہو۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تمہاری مدد کرے۔

جو مجاہد حضرت عتبہؓ کے ساتھ اس موقع پر جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ یمن کے والی علاء الحضرمی کو لکھا گیا کہ عرفجہ بن ہرثمہ کو اُبلہ بھیج دیا جائے۔ دجلہ کا ساحلی علاقہ حضرت عتبہؓ نے فتح کر لیا۔ اُبلہ خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ تھی۔ یہ عمان، بحرین، ہند اور چین کے سمندری راستے کا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ فتوحات کے بعد حضرت عتبہؓ یہاں کے انتظامات سدھارنے پھر رہے تھے کہ الخُرَیبَہ نامی جگہ آ ٹھہرے اور حضرت عمرؓ کو ایک خط لکھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا مقام ضروری ہے جسے سرمائی قیام گاہ بنایا جا سکے اور جب وہ لڑائی سے فارغ ہوں تو اس میں آرام کر سکیں۔ یہ رائے حضرت عمرؓ کو بہت پسند آئی۔ اسلامی سلطنت پھیل رہی تھی۔ دشمنوں پر رعب داب کے لیے ایسی فوجی چھاؤنیوں کی بڑی ضرورت تھی۔ امیر المومنین نے جواب بھیجا — اپنے ساتھیوں کو ایسی جگہ اُتارو جہاں پانی ہو، سرسبزی اور شادابی ہو! حضرت عتبہؓ نے تلاش شروع کی — انھیں ایک شاداب اور گھنے جنگل کا پتہ ملا۔ جس کے اطراف میں پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب تھے۔ اُن میں بانس اُگے ہوئے تھے۔ یہ جگہ خلیج فارس کے ایک کنارے تھی۔ اُبلہ سے بہت قریب! اس کا محلِ وقوع حضرت عمرؓ نے بھی پسند کیا اور یہاں مسلمانوں نے اپنا ایک شہر بسایا۔ یہ مسلمانوں کا بسایا ہوا پہلا شہر ہے۔ اسے بصرہ نام دیا گیا۔ ابو مخنف کا کہنا ہے اسے بصرہ اس لیے کہتے تھے کہ یہاں کنکر اور سیاہ پتھر تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام بصرہ اس لیے رکھا گیا کہ یہاں کی زمین نرم تھی۔ شہر کا نقشہ اس طرح بنایا گیا کہ بیچوں بیچ مسجد کی جگہ رکھی گئی۔ اطراف مسلمانوں نے اپنے خیمے نصب کیے، پھر گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بنا لیں۔ بانس کا یہ شہر اُس زمانے میں ویران ہو جاتا جب مجاہد لڑائیوں پر جاتے۔ لوٹ کر آتے تو پھر وہ بانس کے چھپر کھڑے کر لیتے۔ کچھ ہی دنوں میں تجربہ ہوا کہ ذرا غفلت ہوتی اور بانس آگ پکڑ لیتے تھے۔ جب بھی آگ لگتی، پوری بستی جل کر خاکستر ہو جاتی۔ یہ اطلاع دارالخلافہ بھجوائی گئی تو حضرت عمرؓ کی طرف سے اجازت آئی کہ ان کی جگہ اینٹ اور مٹی کے مکان بنا لیے جائیں۔ اسلامی فنِ تعمیر میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ یہ مسلمانوں کا بسایا ہوا پہلا شہر ہے۔ ہندسی اُصولوں پر یہ شہر بسایا گیا تھا۔ لکیریں سیدھی

تھیں - زاویے قائم تھے - درمیان میں ایوانِ حکومت اور مسجد تھی - مختلف قبیلوں کے لیے مختلف محلے بنائے گئے تھے - ایک خیال ہے کہ جس وقت یہ شہر بسایا گیا اُس وقت حضرت عُتبہؓ کے ساتھ آٹھ سو مسلمان تھے - بلاذری کا خیال ہے کہ بصرے کی بنیاد ۱۴ھ میں پڑی - دوسری رائے ہے کہ ۱۶ھ میں یہ بسایا گیا، یعنی حضرت عمرؓ کی خلافت کے چوتھے سال - کوفے کی بنیاد بھی اسی زمانے میں رکھی گئی تھی، لیکن پہلے بصرہ آباد ہوا - اصمعی کی روایت فتوح البلدان میں ہے - یہیں عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ پیدا ہوئے - یہ پہلا بچہ تھا جو بصرے میں پیدا ہوا -

مسلمانوں کی علمی، ادبی تاریخ میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے - لغات، ادب اور فقہ کے بڑے بڑے مرکز یہاں قائم ہوئے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اس شہر نے خوب پروان چڑھایا - مدینے کے انصار اور شمالی عرب کے بہت سے لوگ نقلِ وطن کر کے یہاں آ بسے تھے - ان کے یہاں آباد ہو جانے سے سلطنتِ عجم کے فتح کرنے میں بڑی مدد ملی -

کوئی چھ مہینے تک حضرت عُتبہ یہاں کے والی رہے - پھر حج کے موقع پر مکہ معظمہ گئے - وہاں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو اُن سے کہا کہ — آپ میرا استعفا قبول کر لیں - یہ اقتدار کے تماشے مجھ سے نہیں ہوتے! پرہیزگار آدمی تھے - دُنیاوی لذتوں سے بے نیاز تھے - اِس لیے جاہ و جلال سے دُور بھاگتے تھے - انہیں وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب شعب بنو ہاشم میں درختوں کے پتے کھا کر زندگی گزارنی پڑتی تھی - حال یہ ہو گیا تھا کہ ان کی آنتوں پر چھالے پڑ گئے تھے - ایک بار بصرہ کی جامع مسجد میں امیر صوبہ کی حیثیت سے خطبہ دیا تو یہ بات بتائی اور کہا کہ — ایک بار جب جسم پر کپڑے تار تار ہو گئے تھے تو ایک چادر مجھے ملی - اس کے دو حصے کر کے ایک کی میں نے تہبند بنائی، ایک سعدؓ کو دے دی — سعدؓ بن ابی وقاص کو! کہتے تھے — اب وہ دن آئے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی شہر کا امیر ہے -

حضرت عمرؓ نے ان کا استعفا منظور نہ کیا اور مجبور کیا کہ واپس بصرہ جائیں - امیرالمومنین

(باقی بر صفحہ ۳۸)

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

مولانا محمد فاروق خاں صاحب - انڈیا

اخلاق کو انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کی مثال نہیں ملتی جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصور نہ پایا جاتا رہا ہو۔ جو لوگ جبریت (DETERMINISM) کے قائل ہیں، وہ بھی علی الاعلان اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک جھوٹ اور سچ میں یا ایمان داری اور مکر و فریب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچائی، خیر پسندی اور سلامت روی انسان کی مطلوب صفات ہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایفائے عہد کے مقابلہ میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی کے مقابلہ میں خود غرضی کو اور جذبۂ اخوت و ہمدردی کے مقابلہ میں بغض و حسد اور ظلم و ستم کو بہتر سمجھنے لگے۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کے مطالبہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جہاں کوئی اختیار و ارادہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں کسی اخلاقی کردار کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ انسان کو دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے۔ اس لیے اس کا ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہی چیز ہے جو اُسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

انسانی افعال و کردار کی کوئی مادی توجیہہ ممکن نہیں۔ شعور کو مادہ کی پیداوار سمجھنا صحیح نہیں،

بے شعور مادہ کا مطالعہ ایک مادی تحقیق ہے۔ مادی اسباب کے ذریعہ سے شعور کی تشریح کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ میکس پلانک (MAX PLANK) نے کہا ہے:-

"کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو محض علت و معلول کے قانون کے ذریعہ اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق کبھی بھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے کسی اور قانون یعنی قانونِ اخلاقیات کی ضرورت ہے"[1]

انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ نفسِ انسانی کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اسے اخلاق و کردار کا حامل قرار دینے کے لیے کوئی وجۂ جواز ممکن نہیں ہے۔

اخلاق و کردار کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی کے علاوہ ایسے حقیقی، مستقل اور مطلق (REAL, PERMANENT AND ABSOLUTE) اقدارِ حیات کی بھی ضرورت ہے۔ جو اخلاقی قوانین کا مدار قرار پائیں۔ جن کی قدر و قیمت اضافی اور عارضی نہ ہو بلکہ ان کی قدر و قیمت مستقل اور ذاتی (INTRINSIC) نوعیت کی ہو جن کے تحفظ کے لیے آدمی اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ نظامِ اخلاق کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا کوئی ایسا مقصود و منتہا نہ ہو، جو مطلق قدر کا حامل ہو، جس کی جانب بڑھنے میں ہم اپنی تمام تر کوششیں صرف کر کے تسکین پا سکیں اور جس تک پہنچنے پر ہماری اپنی تکمیل کا بھی انحصار ہو۔ زندگی کا کوئی بلند مقصود و منتہا ہی آدمی کو ہر قسم کی گمراہیوں اور تلون و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستے پر لگا سکتا ہے۔ اسی کے حصول کی کوشش انسان کی اصل کامیابی اور اس کی اپنی ذات کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی میں بھی اور خاص طور سے ہماری اندرونی زندگی میں بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اوسپنسکی (OSPENSKEY) نے لکھا ہے:-

---

[1] دیکھیے۔ THE UNIVERS IN THE LIGHT OF MODREN PHYSICS

" انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کرلے، اُسے اپنے آپ کو "میں" کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ وحدت حاصل کیے بغیر اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ارادہ نتیجہ ہوا کرتا ہے خواہشات کا۔ جس شخص کی خواہشات ہی مستقل نہ ہوں اس کی حیثیت محض اپنے جذبات اور خارجی تاثرات کے کھلونے کی ہوگی۔ اُسے خبر نہیں ہوسکتی کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کر گزرے گا۔ اس کی زندگی کے ہر لمحہ پر اتفاقات کا پردہ پڑا ہوگا۔"[لہ]

زندگی میں داخلی توافق کی بڑی اہمیت ہے۔ داخلی توافق کے بغیر معاشرہ میں بھی کسی توافق اور وحدت کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ (۲) مسئلہ اخلاقی اقدار (MORAL VALUES) کے حصول کا تو حقیقت کے علم کے بغیر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ راشڈل (RASHDALL) کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے:

" یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر اخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو یا ہمارے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہمارا تصورِ حقیقت متاثر نہ ہوتا ہو۔"

حقیقت سے صرفِ نظر کر کے کسی اعلیٰ اور پائیدار نظامِ اخلاق کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مستقل اور مطلق اخلاقی قدروں کے لیے ناگزیر ہے کہ زندگی اپنی کوئی حقیقی غرض و غایت رکھتی ہو۔ اس کائنات کو کسی عظیم مقصد کے تحت وجود بخشا گیا ہو۔ اور کائنات کی تمام چیزیں محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسباب کی حیثیت رکھتی ہوں۔

پھر اس سے آگے بڑھ کر کسی اخلاقی نظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تسلسلِ حیات

لہ THE NEW MODEL OF UNIVERSE P. 132-33

پا یبان رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر ہماری زندگی مسلسل اور مستقل نہیں ہے تو مستقل قدروں سے ہمارا ربط و تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر انسانی افراد کا منتہائے خیال محض قریبی مفاد کا حصول ہو تو کبھی بھی ان کی سیرتوں میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ایسے افراد پر مشتمل کوئی معاشرہ مستحکم اور پائیدار ہو سکتا ہے۔

میکنزی (MACKENZIE) نے اخلاقی مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ہم کہتے ہیں کہ اخلاقیات کے مطالعہ کا تعلق ایسے انسانی کردار سے ہے جو حق اور خیر کا حامل ہو تو اس سے ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے کہ ہمارا کردار (CONDUCT) کسی ایسے منتہا یا آئیڈیل (END OR IDEAL) کے لیے مفید ہوتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہو اور اس کا تعلق ان قوانین اور اصولوں سے ہوتا ہے جن کی رہنمائی میں ہمارا کردار اس منتہا کے حصول کے لیے صحیح رُخ اختیار کرتا ہے۔ یوں تو مختلف مقاصد کے لیے ہم کام کرتے ہیں، جیسے مکان کی تعمیر، کتاب کی تصنیف وغیرہ، لیکن اخلاقیات میں کردار کا مطالعہ بحیثیت "کُل" (AS A WHOLE) کے مطلوب ہے۔ یہ کسی مخصوص قسم کے کردار کا مطالعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ مختلف مقاصد میں سے کسی ایک مقصد سے تعلق نہیں رکھتا جو اس کے پیشِ نظر ہو، بلکہ اس کا تعلق اس بڑے اور آخری منتہا سے ہے جو ہماری پوری زندگی کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے۔ اس منتہا کو بالعموم "خیرِ اعلیٰ" کی حیثیت دی جاتی ہے"۔ [۱]

دُنیا میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم اور قابلِ قدر شے وہ ہے جسے اہلِ یونان نے ناؤس (NOUS) یا نوئٹک ناؤز (NOETIC NOUS) کا لقب دیا ہے۔ جس کو عربی زبان میں نفس یا نفسِ ناطقہ کہتے ہیں۔ اسی کو بھارت میں آتما سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نفس کی مادہ سے الگ اپنی مستقل ہستی ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے کائنات کے اندر اسے فوقیت حاصل

---

[۱] A MANUAL OF ETHICS P 2

ہے - کائنات میں مرکزی حیثیت نفس کی ہے - کائنات کی ساری رعنائی و دلکشی کا ادراک نفس کے ذریعے ہوتا ہے - اسی کے سبب سے کائنات میں معنویت کی نمود ہے - ساری کائنات کا جوہر حقیقی نفسِ ناطقہ ہی ہے - کائنات میں جو چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں وہ نفس کے امکانات کے سوا اور کچھ نہیں - نفس ہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے - جب اصل صورتِ حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کی کوئی چیز بھی نفسِ انسانی کا مقصود نہیں ہو سکتی - نفس کا مقصود وہی ہو گا جو اس سے عظیم تر اور اعلیٰ ہو - اس لیے لازماً نفسِ انسانی کا مقصود و منتہا ایک نفسِ مطلق (SUPREME AND ABSOLUTE PERSONALITY) ہی ہو سکتا ہے - ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ نفس ہر اعتبار سے اپنا مقصود خود ہے لیکن اس میں بعض ایسی دشواریاں ہیں جن کا حل ممکن نہیں - مثال کے طور پر اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات کے باوجود نفس قائم بالذات نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی خالق نہ ہو - اگر ایسا ہوتا تو وہ کامل ترین (PERFECT IN HIS PERSONALITY) کی صورت میں ہوتا - اسے خود کا پورا علم ہوتا - اس کے لیے ضلالت اور گمراہی کے الفاظ بے معنی ہوتے اور اس کی تکمیل کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا -

اگر نفس کے مقصود کو ہم شخصیت (PERSONALITY) سے عاری تسلیم کریں تو اس صورت میں وہ نفسِ انسانی سے کمتر و فروتر ہو گا - اور اسے کوئی شخص نفس کا مقصود قرار نہیں دے سکتا - اس لیے لازماً اپنا مقصود و منتہیٰ کوئی ذاتِ مطلق (ABSOLUTE PERSONALITY) ہی ہو سکتی ہے - اور یہ وہی ذات ہے جس کو دنیا خدا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے - خدا ہی درحقیقت تمام حقیقتوں کا سرچشمہ اور ہماری ہستی کا اصل مرکز و محور ہے - حاصل یہ ہے کہ ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل کا تصور ذاتِ مطلق کے بغیر ممکن نہیں اور نہ حیاتِ اُخروی پر ایمان لائے بغیر حیات کے تسلسل کا مسئلہ حل ہوتا ہے، جس سے اخلاقی قدروں کے حصول کی راہ ہموار ہوتی ہے -

انسان کے لیے کسی ایسے اخلاقی نظام کا تصور جس کی بنیاد مادیت کے بجائے عالمگیر معنوی اُصولوں پر قائم ہو کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس سے ہماری زندگی مناسبت نہ رکھتی ہو -

ہم میں ہر شخص اپنے ہر دُنیوی معاملہ میں کوئی نہ کوئی معنوی نقطۂ نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ انسان غیر شعوری طور محض میکانی انداز میں اپنا کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا علم و ارادہ کام کرتا ہے۔ مآل اندیشی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ خالص مادیت کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے کہ کوئی اخلاقی اُصولوں کے مطابق عمل کیوں کرے؟ اپنے قریبی مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام کوئی کیوں آئے؟ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہم کیوں اختیار کریں؟ اس میں شبہ نہیں کہ مادیت کے علمبرداروں میں ایسے اشخاص ملتے ہیں جنہوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی حمایت میں وہ سرگرمِ کار رہے ہیں، لیکن ان کا یہ طرزِ عمل ان کے بنیادی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ مادیت کا نہیں، مادیت سے ماورا کسی اور شے کا اثر تھا جو ان کے نفس کے کسی گوشے میں چھپا رہا ہے۔

اخلاقی اقدار کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اخلاق ہی وہ قابلِ قدر جوہر ہے، جس کے ذریعے رُوحانی، مادی اور جمالیاتی (AESTHETIC) قدروں میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ذریعے سے معاشرے میں پائے جانے والے تضادات باہمی توافق میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ قوت ہے جس سے انسان کی زندگی اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ حقیقت کے ساتھ زندگی کی یہی ہم آہنگی اور توافق ہے جس کو مفکرین نے حقیقی آزادی اور حصولِ صداقت سے تعبیر کیا ہے۔

مادہ پرست، مادہ ہی کو اصل حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں جو کچھ بھی ہے وہ محض مادہ کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً ان کے بعض لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ معاشی نظام کی ہیئت ہی میں انسانی زندگی کا سارا راز پنہاں ہے۔ مذہب و اخلاق، تہذیب اور کلچر سب معاشی صورتِ حال کی پیداوار ہیں۔ درحقیقت حقائق کا یہ نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ مارکس اور مارکس کے متبعین کم از کم اگر نفسیات اور اینتھروپولوجی ہی سے واقفیت رکھتے تو نفسیات انہیں بتاتی کہ پیداواری طاقتیں انسانی دماغ کے اعمال و افعال کی تشریح سے یکسر قاصر ہیں۔ انسانی ذہن

ذرائع پیداوار کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایفھترو پولوجی انہیں اس بات سے واقف کراتی کہ رُوحِ انسانی فریبِ محض نہیں ہے بلکہ انسانی کلچر کی پیدائش اور اس کی نشوونما میں درحقیقت اسی کی جلوہ گری ہے۔ مادّی اسباب کو وہی کام میں لاتی اور ان سے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے۔ مختلف اسالیب میں اسی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود یہ کائنات صرف افادیت کی جس سے ہمارے مادّی مفادات وابستہ ہوتے ہیں مظہر ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اندر دوسرے اور قابلِ لحاظ اشارات بھی پائے جاتے ہیں جو افادیت سے برتر ہیں، جن کو نظر انداز کر کے کائنات کی جو توجیہہ بھی کی جائے گی، ناقص اور غلط ہوگی۔ کائنات معنی رکھتی ہے۔ زندگی معنویت کی حامل ہے۔ اس کی دریافت سے مادّیت بالکل قاصر ہے۔ کائنات کے اندر نمایاں طور پر کسی بلند و برتر ذات کے علم و ارادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کائنات کے اندر کسی کے علم و ارادہ کے کارفرما ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ساری کارفرمائی اخلاق کی ہے۔ علم و ارادہ کا ظہور ہمیشہ اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ انسان کی ضروریات اور کائنات کی فراہم کردہ اشیاء میں انتہائی گہرا ربط اور تعلق ہے۔ جسم کو برقرار رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب انسان اپنے خارج میں موجود پاتا ہے۔ یہ بہتے دریا، یہ چشمے اور میدان، یہ مختلف قسم کے درخت اور جانور، یہ پھول، پھل اور کھیتیاں انسان کے فطری مطالبات کا جواب ہیں۔ انہیں خالق کی رحمت کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اشیاء جنہیں ہم اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں، درحقیقت اخلاقِ خداوندی ہی کے زندہ مظاہر ہیں۔

اخلاقی کارفرمائی کی اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح تصویریں موجود ہیں، لیکن انسان ان کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے کی پرورش میں اصل دخل والدین یا اعزہ و اقربا کی اس شفقت و محبت کا ہوتا ہے جو انہیں بچے سے ہوتی ہے۔ یہ اخلاق کا کرشمہ ہے نہ کہ خالص مادّیت کا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اگر ہمیں ذوقِ جمال سے نوازا گیا ہے تو دوسری طرف کائنات کی ہر چیز کو حسن اور آراستگی بخشی گئی ہے۔ اس کو محض مادہ کی کرشمہ سازی

قرار دے کر مطمئن ہو رہنا ذہنی و فکری خودکشی کے مترادف ہے۔ مارکس اور دوسرے مادہ پرست اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک فائق تر شے اپنے سے ادنیٰ درجے کی چیز کی تابع کیوں کر ہو سکتی ہے۔ زندگی شعور و احساس کی ایک آباد دنیا ہے جس کا سرچشمہ کوئی باشعور قادرِ مطلق ذات ہی ہو سکتی ہے اور صرف وہی ذات زندگی کا مقصود و منشا بھی قرار پا سکتی ہے۔ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کر کے صرف یہی نہیں کہ انسان خدا کے حقوق نظرانداز کرتا ہے، بلکہ اس کا یہ رویہ خود اس کے اپنے خلاف بھی ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی حیثیت کو گرا دیتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے جسم کے تمام اعضاء ہاتھ، پیر وغیرہ بظاہر اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت جو کچھ ہے وہ ہماری شخصیت کی نسبت سے ہے۔ اگر ہمارے دست و پا ہماری شخصیت کے تابع نہ ہوں تو ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے۔ نظامِ جسمانی میں مرکزی حیثیت ہماری شخصیت کو حاصل ہے۔ اس لیے ہمارے تمام اعضا اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لیے ہر لمحہ ہمارے دستِ نگر رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اصل حیثیت کی تعیین خدا کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اس نسبت و تعلق کے بغیر ہماری حالت ایک ایسے ہاتھ پیر کی رہ جاتی ہے جس کو جسم سے کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا ہو۔ ایسے کٹے ہوئے ہاتھ پیر اور خاک کے ڈھیر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہتا۔ انسان یہ تو سمجھتا ہے کہ ہاتھ یا پیر کا جسم سے کٹ کر الگ ہونا اس کے لیے ہلاکت ہے۔ لیکن اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے وہ اس ہلاکت کو محسوس کرنے سے بالعموم قاصر رہتا ہے جس میں وہ خدا سے الگ ہو کر مبتلا ہوتا ہے۔

اخلاق انسان کے لیے کوئی ناخوشگوار بوجھ ہرگز نہیں ہے۔ رنگ و بو پھولوں پر بوجھ نہیں پرندوں کے پر پرندوں پر کبھی بار ثابت نہیں ہوتے، بلکہ یہ پر اُن کے لیے باعثِ زینت بھی ہیں اور پرواز میں ان کے مددگار بھی۔ یہی حال پھولوں کے رنگ و بو اور آنکھوں کی پلکوں کا بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بھی حقیقی حُسن و خوبی اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق سے عاری ہو جانے کے بعد انسان کے پاس کوئی قابلِ قدر شے باقی نہیں رہتی۔ اخلاقی مطالبات ہماری فطرت کے اظہار کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اور آفاقی اصول کا نام ہے۔ وہی ہماری باطنی زندگی کا بھی قانون ہے۔ یہ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعے سے انسان کی اندرونی زندگی میں توازن اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی وہ آفاقی اصول ہے، جس کا مشاہدہ ہم کائنات کے نظام میں بھی کرتے ہیں۔ کائنات کی ساری چیزیں ایک صحیح اور فطری قانون کے تابع ہیں، جس کے پیچھے خدا کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے پر آج بڑے سے بڑے مفکر بھی اپنے کو مجبور پا رہے ہیں۔ انھیں یہ ماننا پڑا ہے کہ یہ کائنات ایک مشین کے مشابہ ہونے کے بجائے ایک ذہن سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

(باقی)

(بقیہ مسلمانوں کا پہلا شہر)

کیوں نہ مجبور کرتے۔ ایسے عاملینِ حکومت کو تو وہ ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مسند امام احمد میں ہے حضرت عتبہؓ کہتے تھے ــــ دوستو! میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ حقیر ہونے کے باوجود اپنے کو بڑا سمجھوں۔ نبوت ختم ہوچکی ہے۔ انجام یہ ہوگا کہ اقتدار کے مراکز قائم ہوں گے اور تم بہت جلد ہمارے بعد امیروں کو آزماؤ گے۔

حضرت عتبہؓ نے اپنی خدمت چھوڑ دینے کی جو درخواست امیرالمومنین سے کی تھی جب اُسے اُنھوں نے قبول نہ کیا تو اُسد الغابہ میں ہے کہ سفر کا آغاز کرتے ہی راستے میں دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی کہ بارِ الٰہا! تو مجھے بصرہ نہ پہنچا! دن پر دن منزلیں گزرتی گئیں۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دُعا کا کوئی اثر دیکھنے میں نہ آیا۔ ابن سعد اور ابن کثیر کی روایتیں جوڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کچھ دنوں بعد پیٹ میں درد اُٹھا۔ معدن بنی سلیم تک پہنچے تھے کہ حالت بگڑی ایسی کہ اُونٹ پر سے گر پڑے۔ وہ تکلیف اور یہ صدمہ ۵۷ برس کی عمر تھی گرے تو پھر نہ اُٹھے۔ خدا نے ان کی سُن لی اور بصرہ ہمیشہ کے لیے اُن سے چھوٹ گیا۔

دو پیغام

(۱)

قومی استقلال کیا ہے؟[1]

یوم استقلال کے موقع پر میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ قومی استقلال کے معنی یہ ہیں کہ معاشی صنعتی اور اقتصادی اور دفاعی طور پر ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے ہیں اور ہمیں خود فریبیوں یا بیرونی سہاروں کی ضرورت نہیں۔

عقیدہ و فکر کے لحاظ سے استقلال کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے عقائد کو دورِ غلامی کی آمیزشوں سے پاک کر لیا ہے اور فکر کی اپنی اُصولی بنیادوں کو مضبوط کر کے دوسروں کی مرعوبیت کے بغیر عالمِ افکار کی تعمیر شروع کر دی ہے۔

تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے استقلال کا مفہوم یہ ہے کہ باہر سے تہذیب، معاشرت اور کلچر کا جو تسلط پیدا کیا گیا تھا اس کی زنجیروں کو ہم نے توڑ پھینکا ہے اور اپنی روایت و اقدار اور آئین و آداب کی تجدید کر لی ہے۔

لسانی لحاظ سے استقلال کے معنی یہ ہیں کہ باہر سے کسی غیر زبان کا جو مصنوعی غلبہ ہمارے ذہنوں پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف بغاوت کر کے ہم نے اپنی قومی زبان کو درجہ اول دے دیا ہے

---

[1] یہ پیغام ادارہ سروش (سیالکوٹ) کو بھجوایا گیا۔

اور تعلیم، سرکاری دفاتر، عدالتوں اور کاروبار کے دائروں میں ہماری اپنی قومی زبان پرچم اڑا رہی ہے اور جہاں کہیں عوام کی آسانی کے لئے ضروری ہے ان کی علاقائی بولیاں بھی کام دے سکتی ہیں۔

اسی طرح تعلیمی میدان میں استقلال کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کا نیا ڈھانچہ تیار کر لیا ہے۔ ہم نے اپنے خاص تصورِ خدا اور تصور انسان اور تصور کائنات کو علوم کی بنیاد بنا کر اور وحی الٰہی کو سب سے بڑا سرچشمۂ علم قرار دے کر اپنا راستہ لادینیت پسند نظاموں سے الگ کر لیا ہے اور ان کے مروج نظریات الحادی کو بالکل اکھیڑ پھینکا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے استقلال کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اپنے ادارۂ سیاست کو ان تصورات سے ہٹا کر جن کو امپیریلسٹ قوتوں نے قاہری و ساحری سے ہمارے معاشرے پر ٹھونس دیا تھا۔ اب تعمیر نو اُن نئی بنیادوں پر کی ہے جن کا نقشہ خدا اور رسولؐ کی تعلیمات نے ہمیں اسلام کی شورائی جمہوریت قائم کرنے کے لئے متعین کر کے دیا تھا۔

دفاعی استقلال کا مقام تب حاصل ہوتا ہے جب نہ تو کسی دشمن کو یہ جرأت ہو کہ وہ ہماری زمین کے کسی ایک انچ پر بھی نگاہ حرص ڈال سکے یا ہمارے کسی ایک فرد پر بھی کوئی زیادتی کر سکے، علاوہ ازیں ہماری قوت اتنی خود اعتمادی دینے والی ہو کہ ہم گفت و شنید کی میز پر اور سفارتی رابطوں میں کبھی دب جھک کر معاملہ کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ پھر بھی کہ ہمارا دفاع کسی سپرپاور کی نگاہ ناز کی جنبشوں پر منحصر نہ ہو کہ وہ قرض اور ایڈ دے تو ہم سلامت رہیں، نہ دے یا اس میں کمی کر دے یا کسی مخالف پر زیادہ التفات فرمانے لگے تو ہم اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کریں۔

انتظامی لحاظ سے داخلی استقلال اس قوم کو حاصل ہوتا ہے جس کے شہریوں کی جانیں، مال اور آبروئیں محفوظ ہوں، سرکاری محکمے اور دفاتر اور افسر اور دوسرے قومی ادارے رشوت و خیانت کا سلسلہ نہ چلا سکیں، پولیس یا کوئی قوت شہریوں کو نشانہ تشدد نہ بنا سکے۔ انصاف آسانی سے ملے، مجرم کیفر کردار کو پہنچیں اور تعلیم یا ملازمتوں کے حصول کا دارومدار صرف قابلیت و استحقاق پر ہو، اجارہ داریاں اور مزاحمتیں نہ ہوں۔ مزید یہ کہ ہر شخص کے لئے کفالت کا سامان کیا جا سکے۔

(۲)

جرمنی میں رہنے والے مسلمانوں کے نام

نعیم صدیقیؒ

جرمنی میں رہنے والے بزرگو! بھائیو! بہنوں اور بچو!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، اور راہ ہدایت کو پہچان کر اس پر قدم بڑھانے کی توفیق دے۔ انبیاءؑ کی بتائی ہوئی یہ ہدایت ابدی سکون اور دائمی راحت و مسرت، یعنی جنت تک پہنچاتی ہے۔

ہماری دنیا کی زندگی ایک خارزار کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں کچھ پھول امیدوں کو اکساتے ہیں۔ ایک پھول حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں اور پیروں سے بہنے والے خون کا بہت سا خراج کانٹوں کی خدمت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ کانٹے اس کے جواب میں صرف درد اور کراہیں دے سکتے ہیں۔

گویا یہ زندگی امتحان گاہ ہے، جس کی تاریکیوں میں صرف ایمان کی روشنی کے ذریعے راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ اور بہترین اخلاق کی قوت مشکلات کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔

لیکن آپ سب کے لیے زندگی اور ایمان کا امتحان بہت سخت ہے۔ کیونکہ آپ کے چاروں طرف جو ملحدانہ تمدن پھیلا ہوا ہے، اس نے بڑی بڑی برائیوں کو بڑے خوبصورت لباس پہنا کر نہایت اعلیٰ میک اپ کے ساتھ یہ قوت بھی دے دی ہے کہ برائی کی قوت فلسفے، ادب اور کلچر کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہو۔

آپ چوطرفہ حملوں کے درمیان گھرے ہیں، اور حملہ آور قوت اتنی دلکش ہے جتنا کسی دھاریوں والی ناگن یا کوڑیالے سانپ کو ہونا چاہیے۔ مگر اس حسن و جمال کے پردے میں زہر ہلاہل تک چھپا ہوا ہے۔ لوگوں کی کثرت اپنے آپ کو بدی کی ناگن سے ڈسوا کر اس کی خوبصورتی کی داد دیتی ہے۔ کچھ بیدار دل اور خوش نصیب لوگ اس ناگن کا سر کچل دیتے ہیں یا اس کے زہریلے دانت

ختم کر دیتے ہیں۔

کوئی ایک دین یا نظریہ یا مخصوص نظامِ اقدار و شعائر رکھنے والے ابنائے آدم جب کسی مخالف دین یا نظریے کے تمدن میں گھر جاتے ہیں تو ان کا ایک رویّہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مخالف نظام کے سامنے جھک جائیں یا اس معاشرے کے جسم میں ہضم ہو جائیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ خود تو کسی نہ کسی طرح کھڑے رہیں، لیکن نہ وہاں کے مخالف معاشرہ کی غلط ساخت سے اس کے اکابر و عوام کو آگاہ کرنے کی جرأت کریں۔ اور نہ اپنے اہلِ خانہ، اپنی اولادوں اور اپنے ہم خیال اور ہم مسلک افراد کو بیداریٔ ایمان کے ساتھ اپنے تحفظ اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے متحرک کریں۔ اس صورت میں زیادہ دیر تک خود اپنے آپ کو بھی سلامت نہیں رکھا جا سکتا۔

ایک خدا پرست مسلم فرد یا گروہ کا منصب مادہ پرست معاشروں میں یہ ہے کہ وہ اپنے شعورِ خدا پرستی اور اپنے ایمان و اخلاق کو مضبوط کر کے منظم ہوں اور خود بھی، اپنی مستورات کو بھی اور بچوں کو بھی دینِ حق کے علم اور اسلامی اخلاق سے آراستہ کریں۔ اور پھر مادہ پرست معاشرے کے افراد و عوام کو مناسب طریقوں سے تدریجاً یہ سمجھائیں کہ مادہ پرستانہ زندگی انسان کو دولت، سامان اور وسائل تو دے سکتی ہے، مگر دلی سکون اور پاکیزہ جذبات اور اخلاقی بنیادوں پر قائم ہونے والے انسانی رشتے اور رابطے نہیں دے سکتی، نیز ایسا نظامِ حیات ہرگز قائم نہیں ہو سکتا جس میں حقیقی عدل و توازن پایا جائے۔

آپ سب اپنی اپنی جگہ یہ سمجھیے کہ آپ خدا کے سفیر ہیں اور دینِ حق کے قاصد، جن کو کسی بہانے خدا ناآشنا (سیکولر) تمدنی نظاموں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ آپ خیال کریں کہ خدا کے پیغمبر کیسے کیسے تاریک اور بدراہ ماحول میں تنِ تنہا کھڑے ہو کر دعوتِ حق دیتے تھے۔ اور اکثر اوقات بہت ہی سنگین رویّے اپنی اقوام کی طرف سے بھگتتے تھے۔ مگر نہ وہ اور ان کے ساتھی حالات کے دباؤ سے کبھی بدلے اور جھکے اور نہ انہوں نے کام کرنا ترک کیا۔ بس آپ میں سے ہر شخص انبیاء کا پیرو ہونے کی حیثیت سے دعوتِ حق کے کام کے متعلق یہ سمجھے کہ:

IT DEPENDS UPON ME!

آپ حضرات باہر کے کام کے پروگرام خود بنائیں - گھروں کے اندر ایک مختصر پروگرام دس منٹ کا رکھیں - قرآن ، حدیث ، سیرت ، صحابہ ، تاریخِ اسلام ، تازہ احوال - ان چیزوں سے دو دو موضوعات ایک دن لیں -

خواتین کا اجتماع الگ ہو ، بچوں کا الگ -

بچوں سے سالانہ یا ششماہی بڑے اجتماعات میں کسی قرآنی موضوع ، کسی دینی شخصیت ، عالمِ اسلام کی کسی تحریک وغیرہ پر اردو میں مضامین لکھوا کر مقابلہ کروایا جائے اور انعامات ، ایوارڈز یا نشاناتِ اعزاز دیے جائیں -

اُردو نظمیں (خاص خاص) اور نعتیں یاد کرائی جائیں -

مقامی طور پر ہفتے میں ایک بار بچوں کے لیے (ا د ، ۱۱ ۵) پروگرام سادہ اور آسان سے رکھے جائیں - اس کے لیے کوئی چھوٹی سی کتاب ، بلکہ پمفلٹ ، معین کر دیا جائے کہ اس کے متعلق سوالات کیے جائیں گے -

مزید تدبیریں آپ خود سوچ سکتے ہیں -

اپنے تحفظ کی مساعی اس کے بغیر کامیاب ہو ہی نہیں سکتیں کہ آپ مقامی آبادی کے لوگوں میں دعوت کو پھیلانے کے راستے نکالیں - اس کے لیے چھوٹے چھوٹے چار ورق کے پمفلٹ جاذبِ توجہ عنوانات کے ساتھ پیش کریں - ویڈیو سے موقع ملے تو اپنی بات پہنچائیں - کوشش یہ کریں کہ زیادہ ذہین طبقوں تک آپ کی رسائی ہو - پھر مقامی نومسلم آپ کے ساتھ ہو کر کام کریں -

آخر میں میری دعا ہے کہ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو -

رسائل و مسائل

فوت شدہ نمازوں کی قضا

سوال:- میں بیمار تھا کچھ نمازیں قضا ہوگئیں۔ میرے ایک ساتھی نے کہا نماز قضا نہیں ہوتی۔ یعنی جو رہ گئی وہ رہ گئی۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ میں فقہ کی بات تسلیم نہیں کرتا، قرآن اور حدیث دکھائیں۔

جواب:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من نام عن صلوٰۃ او نسیھا فلیصل اذا ذکرھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز سفر میں نیند کی وجہ سے قضا ہوگئی تھی تو آپ نے اس کی قضا کی۔ یہ تو قضا کی نقلی دلیل ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ جب ایک انسان پر کسی کا قرض ہو تو اس سے بری الذمہ ہونے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں:

۱۔ یہ کہ ادائیگی ہو جائے ۲۔ معافی ہو جائے۔

اس بات کی کوئی دلیل قرآن و سنت سے نہیں ملتی کہ قضا نمازیں معاف ہو جاتی ہیں۔ پس دوسری صورت باقی رہ گئی کہ انہیں ادا کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ دین اللہ احق ان یقضیٰ "اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اُسے ادا کیا جائے"۔ پس آپ کے دوست کی یہ بات کہ جو نمازیں قضا ہوگئیں، انہیں قضا کرنے کی ضرورت نہیں، بے معنی ہے۔ البتہ جان بوجھ کر قضا کرنے کا گناہ اس وقت دور ہوگا جب نماز کی قضا بھی کی جائے اور اس کے ساتھ توبہ بھی۔ (ع۔م)

نظریۂ ارتقا

سوال: اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے میرے ذمے لٹریچر تیار کرنے کا کچھ کام لگایا گیا ہے۔ اِن عنوانات میں نظریۂ ارتقا بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب نے مجھے کہا تھا کہ اِس سلسلہ میں مَیں آپ سے رہنمائی حاصل کروں۔ کیونکہ اِس موضوع پر آپ کی اُن سے کچھ بات چیت ہو چکی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں ہماری کیا راہنمائی فرماتے ہیں؟

جواب:۔ آپ نے مجھے کرنے کے کئی کام[1] اس انداز سے یاد دلا کر ان کے متعلق دریافت کیا ہے، گویا میں آپ جیسے فوجی ماحول کے ایک ڈاکٹر کے ساتھ (جو نوجوان ہے اور جس کا ساتھ نوجوانی بڑھاپے میں بھی نہ چھوڑے گی) باین عمر و صحت مقابلے کی دوڑ لگا رہا ہوں۔ براہ کرم ذرا آہستہ چلیے، مَیں کچھ اپنے اُوپر اور کچھ مسائل پر قابو پا کر آپ سے دو باتیں کرسکوں۔

نظریۂ ارتقاء کے متعلق میرے دل میں اتنے خیالات و تفکرات ہیں کہ ان کی دسوان دھاری پر قابو پانا مشکل ہے۔ پھر مشکل یہ کہ میں نے ایک موضوع سے تھنکرز لائبریری کے لٹریچر کے ذریعے رابطہ شروع کیا اور نظریۂ ارتقاء پر ایچ جی ویلز کی الکتاب بھی میرے سامنے آئی لیکن شروع میں کم علمی کے ساتھ کچھ لکھ کر پھر میں جماعت کے سیاسی بہاؤ کے ساتھ کہیں کا کہیں جا نکلا۔

اوّل تو اب پُرانی باتیں بکھر گئی ہیں، نئی جو پڑھتا ہوں اُن کا ریکارڈ رکھنا چھوڑ دیا ہے آخر آدمی قوتوں کی کمی کے ساتھ کیا کیا کام کرے۔

کل ہی (ARABIA (سابق) (ISLAMIC WORLD REVIEW) کا تازہ شمارہ دیکھا۔ اس میں ایک خاص مضمون اسی موضوع پر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود مغرب میں اور سائنس اور عقل کے سرستوں میں اختلافی بحثیں زوروں پر ہیں۔ آپ منگوا لیجئے تا

---

[1] ان کاموں کی تفصیل شائع نہیں کی جا رہی۔ (ن - ص)

ان دنوں کا شائع ہونے والا لٹریچر ـــــ یعنی دس پانچ سال میں کیا چھپا ۔
میں ارتقاء کی شاخ در شاخ داستان کو جس پر اب پوری طرح حاوی بھی نہیں رہا، اگر خط و کتابت کے ذریعے منتقل کرنا چاہوں تو یہ واقعہ کبھی نمودار ہونے کا ہی نہیں ۔ اور یوں کوئی جامع مقالہ لکھنا چاہوں تو اس کے لیے کم سے کم دو سال کے لیے ہر دوسرا مشغلہ چھوڑ دینا چاہیے ۔ کیا اس صورت میں زندہ رہنے کے انتظامات من جانب اللہ ہوتے رہیں گے جب کہ محنت و کاوش کی ایک شرط جو توکل سے پہلے آتی ہے، وہ تو میں پوری کر ہی نہیں رہا ہوں گا ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ آئیں تو میں چند اشارات نوٹ کر کے ان پر آپ سے گفتگو (بالاختصار) کر سکوں ۔ اس سے آپ پوائنٹس (POINTS) اخذ کر لیں ۔ مگر یہ اب بالکل ممکن نہیں کہ میں آپ کو (REFERENCES) دے سکوں ۔ اس کام کے لیے تو از سر نو دس پانچ کتابوں کو پڑھنا اور ذہن کو تازہ کرنا ضروری ہے ۔ میرے ذہن میں تو بس اس کے خلاف کلیدی اعتراضات ہیں اور فلاسفیکل بحث کے لحاظ سے یہ نظریہ ارتقاء کے برحق ہونے کی مکمل تردید کر دیتے ہیں ۔ رہی بیالوجیکل بحث تو اس میں ہمارا اپنا تو اب تو کوئی (CONTRIBUTION) نہیں ہے ۔ ارتقاء والوں ہی نے جو باتیں اٹھائی ہیں ان میں تضاد اور الجھنیں نکالی جا سکتی ہیں ۔ اور یہ کام بھی یورپ ہی کے سائنسدانوں، بیالوجسٹوں اور عقل سازوں نے کر رکھا ہے ۔ پڑھنے اور ڈھونڈنے کی ضرورت ہے ۔

نظریۂ ارتقاء کے دو بڑے مقاصد (اور نتائج) ہیں ۔

۱ ـــ کائنات اور زندگی سے خدا کے تصور کو خارج کرنا، حالانکہ نظریۂ ارتقاء محض حقیقت نہیں ہے ۔ مگر انسان نے اپنی زندگی سے خدا کو خارج کر دیا ہے ۔

۲ ـــ انسان کو حیوان بنا کر حیوانی طور سے استعمال کرنا ۔

خیر باقی باتیں بعد میں ۔ (ن ـ ص)

مطبوعات

روایت مرتبین : محمد سہیل عمر و جمال پانی پتی - ناشر : مکتبہ روایت ، لاہور -
تقسیم کنندگان : سہیل اکیڈمی محمد علی این مارکیٹ - چوک اردو بازار لاہور ۲ جلد ۳
صفحات ساڑھے تین سو سے زائد - قیمت پیپر بیک -/۶۵ روپے - مجلد -/۷۵ روپے -
جلد ۴ ، صفحات ساڑھے چھ سو سے زائد - قیمت پیپر بیک -/۶۵ روپے ، مجلد -/۷۵ روپے -

بظاہر یہ کتابی سلسلہ ہے جس کے شمارہ ۱ اور ۲ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا - صرف ۳ اور ۴ سامنے ہے - ترجمان القرآن کے عنوانِ مطبوعات کے تحت ہم مجبور ہیں کہ بڑی سے بڑی بات کو کم سے کم لفظوں میں کہیں -

سلیم احمد ہمارے دور کے صاحبِ تفکر، ماہرِ مکالمہ ، عارفِ تجزیہ کاری ، فسیمِ گلشنِ تخلیق اور مجاہدِ میدانِ تنقید تھے ، مختصر یہ کہ بڑے مرتبے کے لکھنے والے ، بہت لکھنے والے اور مختلف میدانوں میں لکھنے والے - بڑے بڑے لکھنے والوں سے ان کے رابطے تھے اور نوخیز قوتوں کو بھی وہ برادرانہ یا دوستانہ فضا میں بحث و مکالمہ کے ذریعے سوچنے اور لکھنے کی تربیت دیتے - عسکری سکول سے متعلق ہونے کے باوجود خود ایک سکول بن گئے - ادب کی فضاؤں میں کسی نہ کسی حریف کے ساتھ کنکوا بازی بھی جاری رہتی اور ایک دنیا ان کا ہنر دیکھ کر عش عش کر اٹھتی - خود مجھ سے بھی اختلاف ہوا مگر میں اختلاف کی بازیاں جیتنے سے زیادہ چونکہ ہم قلمی کے رشتے کا احترام قائم رکھنا اہم سمجھتا تھا لہٰذا طرح دے گیا - خیال تھا کہ کبھی ان کے اعتراضات کا جواب لکھوں گا مگر اب جب وہی نہ رہا تو اپنی باتیں اور کسے سنائیں -
ان دو کتابوں میں جو موصول ہوئی ہیں ، سلیم احمد کی اپنی تحریروں اور گفتگوؤں کے علاوہ ان کے

متعلق دوسرے نامور اصحاب کے خیالات اور تجزیے اور ان کی شخصیت و سوانح اور ان کے فن پر لکھے ہوئے مقالے اتنا کچھ ہے کہ میں نے ان کے مطالعہ ہی میں ایک مہینہ گزار دیا۔ یہاں تو میں تحریروں کی ضروری فہرست لکھنے والوں کے نام بھی عرض نہیں کر سکتا۔

ان کی شخصیت کی رفعتوں اور اس کے اعماق کو سمجھنے کے لئے بڑا اہم کلیدی مضمون ان کے بھائی شمیم احمد کا ہے (بھائی صاحب)۔ ایام کے سارے چکر اور حالات کی وہ ساری ضربیں سامنے آجاتی ہیں جو سلیم کو گھڑ کر بنانے میں کچھ نہ کچھ دخل رکھتی ہیں۔ بقیہ سلیم تو خود بنا۔

سلیم وادیٔ عمر میں جس فکری لکیر پر سفر کرتا ہے وہ مختلف مذہبی منازل سے اسے گزارتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ بدیں وجہ اسلامیت کا عنصر سلیم کی شخصیت اور سلیم کے ہنر سے جدا نہیں ہو سکا مگر وہ عسکری سکول کی اصطلاح کے تحت چاہے تو اسلامی ادب کو مان لے۔ البتہ جہاں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والا کوئی آدمی بولا اس کی حالت غیر ہو جائے گی۔ حالانکہ دیکھنے کی اصل چیز کسی کی ادبی نگارشات ہیں یا اس کا بنیادی ادبی تصور۔ مجھے مثلاً اس تصور ادب سے اتفاق نہیں ہے کہ اسے لازماً "سیکولر" ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا پرست آدمی کا اعتقاد اگر محض آرائشی اور نمائشی نہیں، دل میں اترا ہوا ہے تو اس کے قعرِ ذہن سے جو بھی چیز تخلیق ہو گی اس میں خدا پرستی اس طرح شامل ہو گی جس طرح گلاب کے پھول کی رنگت کے ساتھ مخصوص خوشبو! دنیائے ادب میں میں کسی کو جماعت اسلامی پر غور کرنے کے لئے نہیں پکارتا۔ میں تو گلاب کے پھول والی مندرجہ بالا بات کو سوچنے کے لئے بیان کرتا ہوں۔ آپ نہیں مانتے، نہ مانیں۔ کوئی اس جرم کی وجہ سے مجھے گھمن میں رکھ کر مجھے پتھر مارتا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ میرا صبر اور توازن برقرار رہے۔ میں ہنستے مسکراتے اختلاف کرنا چاہتا ہوں اور اختلاف کرنے یا سننے کے بعد بھی ہنستے مسکراتے اس جذبے سے جدا ہونا چاہتا ہوں کہ پھر ملا جا سکے۔ بار بار ملا جا سکے۔

سلیم کی بات چھیڑیں تو اس سے شاخ در شاخ مبحث نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس حکایتِ لذیذ کی گرفت سے قلم کو نکالتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ "روایت" (۳، ۴) نہ صرف ایک اچھا ذخیرۂ ادب ہے بلکہ سلیم احمد کو سمجھنے کے لئے بالخصوص ایک وقیع مجموعہ نگارشات ہے۔

احکامِ ستر و حجاب مصنف : عبدالرحمٰن کیلانی ۔ ضخامت : مروجہ سائز کے ۸۰ صفحات
قیمت : ۹/- روپے

ناشر : مکتبۃ السلام ، گلی نمبر ۲۰ وسن پورہ ۔ لاہور ۔

تبرّج اور فحاشی کو انسانی معاشرے کی مہلک بیماریوں میں سرِفہرست شمار کیا جاسکتا ہے ۔ یہ بیماری مغرب میں خوب پھیلی پھولی اور بدقسمتی سے بہت سی ترقی پذیر نوآزاد قوموں اور ملکوں نے یہ بیماری مغرب سے ورثہ میں پائی ہے ۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ میں اس موضوع پر مختلف موافق ، ہر ایک کے دلائل اور جوابِ دلائل پر بہت کچھ بلکہ قریبًا تمام مواد جمع کر دیا گیا ہے جس کا مطالعہ بہرحال فائدہ سے خالی نہیں ۔ کتاب میں ستر و حجاب کے فرق کو اچھی طرح سمجھایا گیا ہے اور اس بات کو بھی کہ احکامِ حجاب پر احوال و ظروف کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ مؤلف ابتداء میں متشددانہ نقطۂ نظر کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں ۔ خاص طور پر انہوں نے شام کے مشہور سلفی عالم ناصرالدین البانی پر بھی ان کے لچک دار رویہ کی وجہ سے تنقید کی ہے تاہم آخری حصے میں استثنائی احکام کی بحث کے بعد "اعتدال کی راہ" کے زیرِ عنوان احکام و قانون کی جکڑ بندیوں کے بجائے "مقصدِ حجاب" کو ہی رہنما اصول قرار دیا ہے ۔ کتابچہ کے آخر میں مخالفین کے اعتراضات بلکہ مخالفوں پر بھی مختصر مگر جامع تبصرہ موجود ہے ۔ اس مختصر رسالہ کا مطالعہ بہت مفید ہوگا ۔

سندھ کے حالات کی سچی تصویر از جناب محمد موسیٰ بھٹو ، سندھ نیشنل اکیڈیمی ، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸ حیدرآباد ۔ قیمت : ۱۵/- روپے

زندہ اور ذی شعور اقوام اپنے ہر علاقے اور آبادی کے ہر حصے کے متعلق دس بیس سال پہلے سے اندازہ کر لیتی ہیں کہ وہاں کیا ہونا ممکن ہے اور پیش بندی اور تدارک کی صورتیں کیا ہیں ۔ اگر نگاہیں اتنی رسا نہ ہوں تو پھر جہاں کہیں سے کوئی طوفان اٹھنے والا ہو اس کے ابتدائی جھونکوں اور لہروں پہ پوری توجہ دی جاتی ہے اور بالکل ابتدائی مرحلے پر خرابی کے ہر جزو کا کوئی حل نکال لیا

جاتا ہے ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے سانحہ رونما ہوا۔
سندھ میں اول روز سے کچھ اضطراب انگیز مسائل موجود رہے ہیں ان مسائل پر خود ہم نے اتنی توجہ نہیں دی جتنی ہمارے معاندین نے دی ۔جنہوں نے کچھ اندر سے اور کچھ باہر سے ان کو زیادہ بگاڑا۔ ہمارے ہاں سے اگر کسی بگاڑ کی بعد از وقت اصلاح کی کوشش کی گئی تو اس بد تدبیری سے کی گئی کہ حالات اور خراب ہو گئے۔
محمد موسیٰ بھٹو نے پچھلی ساری کہانی کو بیان کر دیا ہے ۔ انہوں نے جدید سندھ پہ ہندوؤں کے اثر و نفوذ کو واضح کیا ۔ سندھ میں اٹھنے والی مختلف جدید تحریکوں اور فتنوں کا جائزہ لیا ہے ۔ وہاں کے ذہنی و فکری رہنماؤں کی گمراہیوں کا راز کھولا ہے اور اسلامی علوم کے علاوہ اسلامی ادب کی معیار زمانہ کے مطابق تخلیقات کے فقدان (یا شدید کمی و بے اثری) کا رونا رویا ہے ۔ اوّل اوّل کراچی کے مرکز حکومت بننے ، ون یونٹ قائم ہونے اور پھر ٹوٹنے ، بھٹو کے خاص کردار اور پھر مارشل لاء کے ظہور کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا گیا ۔ مؤلف کے نقطہ نظر سے اختلاف کرنے والوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ مفید ہو گا ۔

نعتوں کے گلاب | از جناب پروفیسر عاصی کرنالی ، ناشر : کاروانِ ادب ، ملتان لاہور
صفحات : ۱۱۱ ، مجلد مع گرد پوش قیمت : ۳۰/- روپے
پروفیسر عاصی کرنالی فنی لحاظ سے بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔خصوصیت سے غزل پہ ان کو بہت قدرت حاصل ہے اور یہ ان کا کمال ہے کہ اس صنف میں پاکیزگی فکر و حرف کا انہوں نے ایک معیار قائم کیا ہے ۔ زبان کے لحاظ سے وہ گویا اہل زبان ہیں ۔ میرے دیرینہ محب اور ایسے چند خاص دوستوں میں سے ہیں جن سے میرا دلی رابطہ برسوں تک بالمشافہ ملاقاتوں سے محرومی کے باوجود تر و تازہ رہتا ہے ۔
اب کی انہوں نے ذرا اور اونچی پرواز کی ہے اور چمنستانِ کہکشاں اور قطعۂ سدرہ سے نعتوں کے گلاب چن چن کر ایک گلدستہ سجا کر قدر شناسوں کے سامنے لا رکھا ہے ۔ سادہ سا ابتدائیہ اپنے ہی

قلم سے ڈیڑھ صفحے کا ہے "پکی بات"۔ بس نہ کوئی فلیپ ، نہ تقریظ ، نہ تعارف نہ تحسین۔ محمد رسول اللہ کے دربارِ محبت میں داخل ہونے والوں کی نگہ اِدھر اُدھر جائے ہی کیوں ؟

ایک نعت کے چند شعر ؎

لبِ صادق سے ان کے جو سخن تقریر ہو جائے کبھی قرآن بن جائے کبھی تفسیر ہو جائے
تمنا ہے کسی شب خواب میں ان کی زیارت ہو تمنا ہے کسی شب خواب ہی تعبیر ہو جائے
میں جب دیکھوں، جدھر دیکھوں، جہاں دیکھوں تجھے دیکھوں تو میری آنکھ کی پتلی پہ یوں تحریر ہو جائے
جِسے میں مدحِ آنحضرتؐ کے لائق کہہ سکوں عاصی اک ایسی نعت ساری عمر میں تحریر ہو جائے

وہ جیسی نعت کہنے کے تمنائی ہیں نہ جانے وہ کیا ہوگی ؟

ان چار اشعار سے نمایاں ہے کہ رسولؐ پاک کے لئے ان کا جذبۂ صادق بہت والہانہ ہے۔ ان کے بیان میں لطافت ہے۔ وہ تشبیہات سے کام ہی نہیں لیتے۔ شعر میں تشبیہاتی عناصر اپنے تخیل کے زور سے پیدا کر لیتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی پہ حضورؐ کے تحریر ہو جانے کا تصور کیجئے۔ فن کی ایسی نزاکتیں ہر کسی کے بس میں کہاں۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عاصی کرنالی کا فن اصلاً نعت نگاری کے لئے تھا اور وہ اسے شعر کی دوسری اصناف میں استعمال کر کے ہر طرف علو اور پاکیزگی پھیلاتے رہے۔ ان کے سارے کلام کی روح میں وہی خوشبو بسی ہے جیسے نعتوں کے گلاب انجمن اہل ذوق میں پھیلا رہے ہیں۔

الحمد للہ آج پروفیسر عاصی حسانیؒ سلسلے کے شاعر ہیں۔

مخمور سعیدی | از جناب اطہر فاروقی : ناشر: علامہ اقبال کلچرل سوسائٹی، سکندر آباد، شاخ دہلی۔

تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۔ ۹۔ گولا مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ۔

قیمت بھارت میں : -/۵۰ روپے۔

میرا پہلا تعارف مخمور سعیدی سے بھارت کے کسی ریڈیائی مشاعرے کے ذریعے ہوا۔ آواز سے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی باوقار سی شخصیت ہے جس کے اندر بہت گہرا سوز و گداز موجود ہے۔ فنی قدرت

بھی بہت اور زبان کی صحت کا بھی لحاظ۔ بعد میں کہیں کہیں کوئی پڑھنے کی چیز پڑھی۔ مگر اطہر فاروقی صاحب نے اس شخصیت کو اپنی کتاب میں محفوظ کر کے اچھا کام کیا ہے۔ جس نے نظم و نثر، مجموعوں اور تراجم سمیت ۱۸ چیزیں چھوڑیں اور بھارت میں کئی سرکاری اعزازات حاصل کئے۔ بقول رفعت سروش "چھٹے دہے میں ابھرنے والی سب سے نمایاں آواز" (ص ۲۵)

تاجیک ترکی خاندان کے تعلقات ایک افغان قبیلے سے استوار ہو گئے جو ٹونک (راجستھان) میں بسا اور اسی خاندان کی آغوش میں مخمور سعیدی (سلطان محمد خاں) پروان چڑھا۔ آخری دور دلی میں گزارا۔ ایک رباعی سے انداز کلام کا تصور حاصل کیجئے۔

چپ چپ سی دریچوں کی نظر ہے تجھ بن کمروں کی فضا خاک بسر ہے تجھ بن
جاگا تھا جو اک تری آہٹ سن کر سویا ہوا برسوں سے وہ گھر ہے تجھ بن

اس مجموعۂ مضامین میں مخمور کی شخصیت اور فن کے متعلق اطہر فاروقی، رفعت سروش، رام کرشن مضطر انور صدیقی، رشید حسن خان، ابوالفیض سحر، مصور سبزواری، کرامت علی کرامت، شکیل احمد عاصم بریلوی، مجتبیٰ حسین، نثار احمد صدیقی (انٹرویو نگار) علی حیدر ملک نے قابل قدر سامان مطالعہ فراہم کیا ہے۔

انصاف | مدیر: سیف اللہ خالد: باہتمام روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن، اراکان برما۔ زرتعاون برائے پاک و ہند۔ -/۵ روپے (غالباً فی پرچہ)

برمی مسلمانوں کے جگر ایک عرصہ سے جس طرح برملے جا رہے ہیں اس کی خبر پوری طرح باہر کی دنیا کو نہ تھی۔ کبھی کبھار کوئی مراسلہ چھپ جاتا، یا کسی اخبار میں وہاں کی کوئی خبر (کچھ مرنکالنے کے بعد) دی جاتی، تب تھوڑا سا علم ہوتا ہے کہ اس کوچے میں کیا ہو رہا ہے۔ ستم یہ کہ حکمران اکثریت ایک تو زیادہ تر متعصب بودھ ہے اور دوسرے سوشلسٹ۔ یعنی دو متعصب اور دشمنیاں جمع ہو گئیں۔ اب رسالہ انصاف کے اجراء کے بعد وہاں کے حالات پوری تفصیل سے سامنے آنے لگے ہیں۔ اور اس رسالے میں دینی تلقینات بھی شامل رہتی ہیں۔ جو پرچہ ہمارے سامنے آیا ہے وہ کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاس — از جناب میاں گلزار احمد عزیز۔ ناشر: شارکیس لیبارٹریز لمیٹڈ، صادق آباد ایمپلائیز کالونی، ڈھرکی، ضلع سکھر۔ قیمت: ۵/- روپے

یہ چھوٹی سی کتاب محمد امین باجوہ صاحب کے اہتمام سے صادق آباد کی ہردلعزیز شخصیت ڈاکٹر مسلم شہید کی یاد میں اور ان کی خواہش کی تکمیل کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ اس میں حضورؐ کے ۴۰ خطاب جمع ہیں۔ خطبات مختلف مواقع سے متعلق ہیں اور آنحضورؐ کی نہ صرف شخصیت کے مختلف پہلو سامنے لاتے ہیں۔ بلکہ تاریخی مراحل کا اشارہ بھی ان سے ملتا ہے۔ خدا باجوہ صاحب اور مرتب اور ڈاکٹر مسلم شہید کے لیے اس کوشش کو سرمایۂ مغفرت بنائے۔

کیا اسلام مالی معاملات میں مدت کا لحاظ کرتا ہے؟ — از سید حامد عبدالرحمٰن الکاف۔
ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۱۰-سی/۱۶۳ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی۔ پاکستان۔
قیمت: ۲۰/- روپے (خاصی ارزاں)

سید حامد الکاف میرے دیرینہ دوست ہیں اور بہت بیدار دل۔ حال میں جب غیر سودی نظام کا آغاز کرتے ہوئے کچھ بحثیں مسئلہ سود کی مختلف اشکال کے متعلق عرب ممالک میں پیدا ہوئیں تو سود کو نیا پیرایہ دینے والے مفکرین کے خلاف جن لوگوں نے کام کیا ان میں سید حامد الکاف کی کوشش کو بڑا دخل حاصل ہے۔ انہوں نے جدید قسم کے سودی ہیرپھیر کے طریقوں کو اور نئے مغالطہ انگیزیت کا تجزیہ کر کے بے نقاب کیا ہے۔ یہ کتاب جس کے بعض مقالات پہلے شائع ہو چکے ہیں، پاکستان میں بھی اس کی بہت ضرورت ہے۔ ماڈرن ازم کے طیارے کے لیے یہ ایک اچھا میزائیل ہے۔

اس کی روشنی میں آج کل کے بنکوں کی اسکیموں، سرمایہ طلب کرنے والے مالی اداروں کے نئے نئے کشش دار منصوبوں اور غریبوں کا جی للچانے والی لاٹریوں اور انعاموں اور اقساط پر مروجہ قیمتی اشیاء کے فوری حصول کے اعلانوں کو جانچنے کے لیے یہ کتاب بہت رہنمائی دیگی۔
یہ کتاب انگریزی میں ہے۔

ابن عبدالشکور کی کتابیں مؤلف: ابن عبدالشکور۔ ناشر: تاج کمپنی، ۱۳۵۱ ترکمان گیٹ دہلی - ۱۱۰۰۰۶۔ پاکستان میں ملنے کا پتہ: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور ۸

یہ چار مختصر کتابیں ہیں۔ ۱۔ حضرت زینب، رقیہ، کلثوم (رضی اللہ تعالیٰ علیہن) ۲۔ حضرت زینبؓ بنتِ جحش، ۳۔ جناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی - ۴۔ حضرت زبیرؓ بن العوام۔

ان کتابوں میں متذکرہ شخصیات کی سوانح اس طرح آئی ہیں کہ یہ مؤثر ذریعۂ تبلیغ بھی ہیں۔

قیمتیں علی الترتیب ۵/- روپے، ۱۲/- روپے، ۵/- روپے اور ۸/- روپے ہیں۔ (غالباً بھارتی سکے کے حساب سے)

ماہنامہ منہاج القرآن مدیر جناب جاوید القادری۔ زیرِ سرپرستی پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔ مقامِ اشاعت: ادارہ منہاج القرآن، ۳۶۵ ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور

قیمت: عام شمارہ ۵/- روپے۔ سالانہ ۵۰/- روپے

دینی و مذہبی رسائل میں ایک نمایاں اضافہ۔ جناب طاہر القادری دو طرفہ علوم سے آراستہ ہیں۔ وہ جو بھی مسلک رکھتے ہوں، بہر حال بہت بڑے کام کا منصوبہ ان کے سامنے ہے۔ دُعا ہے کہ وہ اور ان کا ادارہ ملت میں اتحاد کا ذریعہ بنیں۔

ظرافت مدیر: ضیاء الحق قاسمی۔ مقامِ اشاعت ۳/۶ صدیق پلازا۔ حیدر آباد سندھ۔

قیمت فی شمارہ ۴/- روپے، سالانہ ۶۰/- روپے

یہ ہے واقعی ایک نوع کی خدمتِ انسانیت کہ آپ کانٹوں بھری وادیٔ حیات میں مسافرانِ ستم کشیدہ پر مسکراہٹوں کے چند پھول بکھیرتے رہیں۔ ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو اپنے غموں کے کانٹوں کی چبھن کے احساس کو دبا کر دوسروں کے لیے ہنستے ہیں۔ یہی خدمت مزاحیہ جریدہ فلاں کی ہوتی ہے۔ سو میں نے اب تک ظرافت کے جو پرچے پڑھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظرافت کا اپنا حال اندر سے خواہ کتنا ہی پتلا ہو، اس کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے۔ آفرین ہے بھئی!

ہماری ثقافت کیا ہے؟ | مرتب و ناشر: محمد اکرم جوئیہ، بی اے ایل ایل بی - ایڈووکیٹ نصیر والا - ضلع میانوالی -

مؤلف ایک دردمند نوجوان ہیں اور مسلمان کی نظر سے مسائل حیات کو دیکھتے ہیں، اور تعمیر و اصلاح کا احساس دلاتے ہیں، بلکہ جذبۂ انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - ثقافت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا اُسے ضرور پڑھنا چاہیے -

---

ساتھی | بہ ادارت: مجلس انتخاب - مقامِ اشاعت: سلیم الوتیو، ایف ۱۰۶، گلشنِ اقبال، بی ۱۳ - کراچی ۱۴ - قیمت: ۱۲/- روپے

یہ رسالہ جو بچوں کے لیے خاص ہے، بہت دلچسپ ہے - بالعموم اس کا ٹائیٹل ہی دل کو کھینچ لیتا ہے - اندر کہانیاں، نظمیں، گیت، لطیفے، کارٹون، معلومات، مزاحیہ مضامین، معمّے، سوالات، بچوں کے خطوط سبھی کچھ ہے -

---

پیغام | بہ ادارت: مجلس مدیران - مقامِ اشاعت - ۱۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور قیمت: ۲/- روپے سالانہ ۲۵/- روپے

یہ بھی "ساتھی" کا بھائی ہے، مگر طرز و انداز ذرا سا مختلف ہے - رہے مضامین و مندرجات تو وہ بھی ویسے ہی ہیں، جن کا تقاضا بچوں کی نفسیات کرتی ہے -

---

ماہنامہ آموزگار | مدیر: پروفیسر اکبر رحمانی - مقامِ اشاعت: کاشانۂ سہیل، ۳ بھوانی پیٹھ، جلگاؤں - ۴۲۵۰۰۱ (ایم پیس)

اس رسالے کے کئی شمارے نظر سے گزرے - کاغذ اور طباعت کی کمزوری سے صرفِ نظر کر کے میں نے جب غور کیا تو اس رسالے کا خاصا وزن نکلا - تعلیمی و تدریسی امور پر اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت اچھے مضامین اور نوٹس شائع ہوتے ہیں - نصاب اور اصولِ تعلیم، تعلیمی نظریات، بچوں کی نفسیات وغیرہ سے متعلق اچھا مواد شائع ہوتا ہے -

---

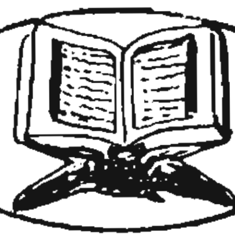
تحقیقات و تاثرات مؤلف و ناشر: جناب اکبر رحمانی۔ ملنے کے پتوں میں سے ایک: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی، نئی دہلی، علی گڑھ۔ قیمت: ۳۵/- روپے

جناب لمعہ حیدر آبادی کی شخصیت اور ان کے فنی و سماجی مقام کو اس کتاب میں پیش کرتے ہوئے جناب اکبر رحمانی نے بنیادِ مبحث اقبال اور ٹیگور کی لمعہ حیدر آبادی سے خط و کتابت پر رکھی ہے۔ اس سلسلے کے چار مقالات میں وسیع مطالعہ و تحقیق کے بل پر جناب اکبر رحمانی نے بعض ایسے انکشافات کیے ہیں جن کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ خصوصاً علامہ اقبال اور لمعہ حیدر آبادی کے رابطہ کی وسعتیں ان مقالات کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ مکاتیب ہی کی مدد سے علامہ سے جناب لمعہ کے شخصی تعلقات کے بہت سے پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔

تنقید و تاثرات کے ایک الگ حصے میں "مثنوی سحر المعاں کا تنقیدی مطالعہ"، "منشی پریم چند اور ترقی پسندی"، "احتشام حسین کی افسانہ نگاری"، "ادب، زندگی اور مقصد" کے عنوانات سے تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ "ادب، زندگی اور مقصد" ایک اہم اصولی موضوع پر بہت متوازن تحریر ہے۔ آخر میں تین ادبی شخصیتوں — احتشام حسین، پریم چند اور مولوی عبدالحق پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

آغاز میں عصمت جاوید (پیش لفظ)، ڈاکٹر اخلاق اثر (مقدمہ)، محمد حسین فاروقی (تعارف) اور اکبر رحمانی (سخن ہائے گفتنی) نے کتاب کے مندرجات کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔
اگر ہمارے پاس زیادہ گنجائش ہوتی تو ہم چند صفحوں میں ضروری مباحث کو پیش کر کے اپنی رائے دیتے۔





تحریکِ اسلامی

دعوت و تنظیم

از: سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب و تدوین: سیّد اسعد گیلانی۔ ایم۔ اے
سیّد سعد بن اسعد۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

○ تحریکِ اسلامی کی دعوت ہزار ہا صفحات میں سے سمٹ کر ایک گلدستہ کی صورت میں۔
○ تنظیم تحریکِ اسلامی ہزار ہا صفحات میں سے نچوڑ کر ایک منظم و مربوط مجموعہ کی صورت میں۔

- **ایک ہی کتاب** : سب دینی ضروریات کی کفیل
- **ایک ہی کتاب** : تحریکِ اسلامی کی عظیم تنظیم کی عکاس
- **ایک ہی مجموعہ** : ہر دینی اور تحریکی ضرورت کا نقاش

آپ کی لائبریری کے لیے:

ایک مستند کتاب

○ ضخامت : ۱۴۸ صفحات
○ سائز : ۲۳ × ۳۶ / ۱۶
○ قیمت : ۵۰/۱۷ روپے

ادارہ
ترجمان القرآن
(پرائیویٹ) **لمیٹڈ**
اردو بازار - لاہور
فون نمبر: ۶۸۶۳۶ - ۳۲۴۴۶۸

استفسارات

از: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

ترتیب و تدوین: اختر حجازی

- ○ مولانا مرحوم فہمِ دین کے فن کے شناور تھے۔ ان کی مجلس سے کوئی تشنہ نہ اٹھتا تھا۔
- ○ مولانا مرحوم سینکڑوں مجالس میں ہزاروں سوالات کے جوابات دیتے اور کوئی محروم نہ رہتا تھا۔
- ○ مولانا کے ہزاروں معتقدین تھے جو طلبِ دین کیلیے اُن سے رجوع کرتے تھے اور کوئی مایوس نہ لوٹتا تھا۔
- ○ یہ خصوصیت مولانا مودودیؒ کو خداداد صلاحیت کے طور پر حاصل تھی۔
- ○ لوگوں نے ہزاروں سوالات کیے مولانا مودودیؒ نے ہزاروں جوابات دیے

مولانا اختر حجازی صاحب کی ہمّت اور محنت ہے، کہ انھوں نے ان سوالات کو مع جوابات حاصل کر کے ایک ایسا مجموعہ مرتب کر دیا جو تشنگانِ علم کیلیے سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے

- ○ ایک کتاب سے عالم کتاب بن جانے کا نسخہ حاضرِ خدمت ہے۔

سائز: ۲۳ × ۱۸ / ۸ • صفحات: ۴۴۸ • قیمت: -/۴۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور